www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

November 2000 • No. 288

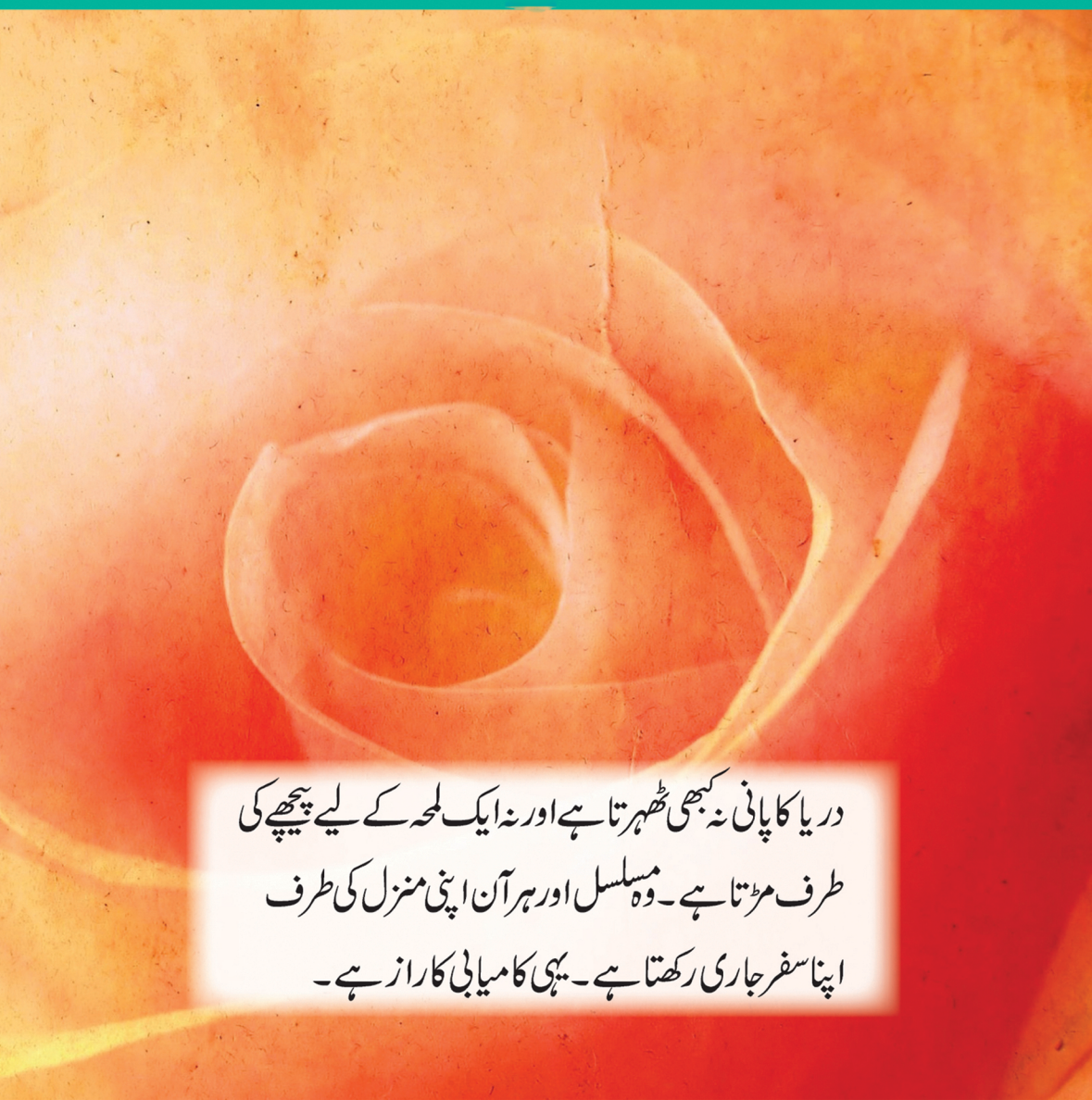

دریا کا پانی نہ کبھی ٹھہرتا ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے پیچھے کی طرف مڑتا ہے۔ وہ مسلسل اور ہر آن اپنی منزل کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔

الرسالہ، نومبر ۲۰۰۰

فہرست

محبت صرف اللہ کے لئے	4
درخت کی مثال	7
بھاری قیمت	10
صحیح طرز فکر	12
دو نکاتی پروگرام	15
ہریانہ کا سفر	17
سوال و جواب برائے اردو نیوز (جدّہ)	33
ایک خط	37
خبر نامہ اسلامی مرکز ۱۵۰	41
ایجنسی الرسالہ	50

محبت صرف اللہ کے لئے

محبت کا جذبہ انسان کے اندر سب سے زیادہ اعلیٰ جذبہ ہے۔ ایک شخص کسی دوسرے کو جو سب سے زیادہ قیمتی تحفہ دے سکتا ہے وہ یہی محبت کا تحفہ ہے۔ موجودہ دنیا میں کسی انسان کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے محبت کے جذبہ کو کسی اور طرف بھٹکنے نہ دے۔ وہ صرف اللہ کو اپنے جذبات محبت کا مرکز بنائے۔ کسی اور چیز کو اپنے حب شدید کا مرکز بنانا، قرآن کی زبان میں، اس کو اللہ کے برابر ٹھہرانا ہے۔ اللہ کی اس دنیا میں جو آدمی کسی اور چیز کو اللہ کے برابر ٹھہرائے وہ اللہ کے نزدیک سراسر بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہئے۔ اور جو ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ زور سارا کا سارا اللہ کا ہے اور اللہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔ (البقرہ ۱۶۵)

دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر انسان کے اندر ان کے لئے محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ چیزیں اس لئے نہیں ہیں کہ آدمی ان کے ساتھ حقیقی محبت کا تعلق قائم کرے۔ یہ چیزیں صرف برائے آزمائش ہیں۔ اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسانوں میں سے کون ہے جو ان چیزوں کو اپنا محبوب بناتا ہے اور وہ کون ہے جو ان سے اوپر اٹھ جاتا ہے، اس کے لئے کوئی چیز اللہ کے ساتھ حب شدید میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

لوگوں کے لئے خوش نما کر دی گئی ہے محبت خواہشوں کی ـــــ عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتی، یہ دنیوی زندگی کے سامان ہیں۔ اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے، کہو، کیا میں تم کو بتاؤں اس سے بہتر چیز، ان لوگوں کے لئے جو ڈرتے ہیں۔ ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور

پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی رضامندی ہوگی اور اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے بندے۔ (آل عمران ۱۴۔۱۵)

موجودہ دنیا میں ایک اندیشہ یہ ہے کہ آدمی سے اس کی کوئی محبوب چیز کھو جائے، اور پھر اس کی یاد میں وہ اپنے آپ کو اتنا زیادہ ہلکان کر لے کہ اس کے دل میں اللہ کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے۔ اس لئے اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر چیز کو اللہ کی ملک سمجھو اور اس کے کھوئے جانے پر یہ سوچ کر صبر کر لو کہ جب تک اللہ نے چاہا وہ چیز میرے پاس رہی اور جب اللہ نے چاہا وہ چیز مجھ سے جدا ہوگئی۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کے ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ (البقرہ ۱۵۵۔۱۵۶)

محبت کے جذبہ کو گہرائی کے ساتھ اللہ سے وابستہ رکھنے کے لئے ایک اور خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ انسان کو پیشگی طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ آخری انجام کے اعتبار سے یہ چیزیں سراسر بے حقیقت ہیں۔ آج کی زندگی میں جو چیز آدمی کو بہت خوشنما نظر آتی ہے اور وہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے، موت کے بعد والی ابدی زندگی میں ان کے اندر اس کے لئے کشش نہ ہوگی۔ حقیقت کھلنے کے بعد آدمی ان چیزوں سے اس طرح بھاگے گا جیسے کہ وہ اس کے لئے بہت بڑی مصیبت ہوں۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

پس جب وہ کانوں کو بہرہ کر دینے والا شور برپا ہوگا۔ جس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے، اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ ان میں سے ہر شخص کو اس دن ایسا فکر لگا ہوگا جو اس کو کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے، خوشی کرتے ہوئے اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اڑ رہی ہوگی، ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی لوگ منکر ہیں، ڈھیٹ ہیں۔ (العبس ۳۳۔۴۲)

دنیا کی جو چیزیں اپنی ظاہری خوش نمائی کی بنا پر انسان کو فریب میں مبتلا کرتی ہیں، ان کے بارے میں قرآن وحدیث میں کثرت سے ایسے حوالے ہیں جو ان چیزوں کی اصل حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مال کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تم ساری زندگی اس کوشش میں لگے رہتے ہو کہ تمہارے پاس مال کا انبار اکٹھا ہو جائے۔ حالانکہ تم بہت جلد اس طرح مر جاتے ہو کہ مال کا کوئی حصہ تمہارے ساتھ نہیں جاتا۔ چنانچہ فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص نے تم کو غفلت میں رکھا، یہاں تک کہ تم مر کر قبروں میں پہنچ گئے۔ (التکاثر ۱۔ ۲)

اسی طرح عورت ہر زمانہ میں اس کا سبب بنی رہی ہے کہ وہ انسان کی توجہ کو حق سے ہٹا دے۔ انسان عورت کی محبت میں اتنا زیادہ گم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: **مار أیت من ناقصات عقل و دین اغلب للب الرجل الحازم من احداکن** (مسلم، کتاب الایمان) یعنی میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو ناقص عقل اور ناقص دین کے باوجود ایک دانش مند آدمی کی عقل پر اتنی زیادہ غالب آجائے۔

انسان کے پاس اپنے رب کے سامنے پیش کرنے کے لئے جو سب سے قیمتی اثاثہ ہے، وہ یہی محبت کا اثاثہ ہے۔ آخرت میں وہی شخص کامیاب ہوگا جس کے بارے میں زمین وآسمان یہ گواہی دیں کہ اس نے اپنا یہ سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ غیر مشترک طور پر اپنے رب کے لئے پیش کر دیا تھا۔

اللہ جب تک غیب میں ہے انسان اس کو بھلا کر دوسری بے حقیقت چیزوں کو اپنا مرکز محبت بنا لیتا ہے، مگر قیامت میں جب اللہ اپنے عظمت وجلال کے ساتھ ظاہر ہوگا تو تمام دوسری چیزیں بالکل بے رونق دکھائی دینے لگیں گی، ہر چیز اپنی کشش کھو دے گی۔ اس وقت انسان حسرت وافسوس کے ساتھ سوچے گا کہ اصل قابل توجہ ہستی تو صرف اللہ کی تھی۔ مگر میں اپنے اندھے پن کی بنا پر دوسری بے حقیقت چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنائے رہا۔ اس وقت انسان اپنے تباہ کن غلطی پر پشیمان ہوگا، مگر اس دن کا پشیمان ہونا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ دن اپنے عمل کا انجام پانے کا دن ہوگا، نہ کہ عمل کرنے کا دن۔

درخت کی مثال

درخت خدا کی ایک انڈسٹری ہے۔ درخت کا آغاز ایک چھوٹے بیج سے ہوتا ہے۔ بیج کے اندر وہ تمام امکانات نہایت کاریگری کے ساتھ سموئے ہوتے ہیں کہ جب بھی اس کو موافق حالات ملیں وہ ایک درخت کی صورت میں اپنے کو ظاہر کرنا شروع کر دے۔

بیج کے بونے کی جگہ مٹی ہے۔ آپ بیج کو پتھر میں ڈال کر اس کے متوقع نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔ بیج کو جب مٹی میں ڈالا جاتا ہے تو اچانک وہ پوری کائنات سے اس طرح جڑ جاتا ہے جیسے کہ ساری کائنات صرف اسی کی پرورش کے لئے بنائی گئی تھی۔ مٹی نرم ہو کر اس کو موقع دیتی ہے کہ وہ اس کے اندر اپنی جڑیں داخل کرے۔ بیکٹیریا کروڑوں کی تعداد میں اس کے جڑوں میں جمع ہو جاتے ہیں تاکہ فضا سے نائٹروجن الگ کر کے اس کی خوراک فراہم کریں۔ زمین کی تہیں اپنی معدنیات اور نمکیات کو پانی میں گھول کر اس کی جڑوں کو پہنچاتی ہیں تاکہ وہ کھنچ کھنچ کر اوپر کی طرف جائے اور درخت کی نشو ونما کا ذریعہ بنے۔ زمین سے لے کر سورج تک کائنات کا پورا کارخانہ متحرک ہو جاتا ہے تاکہ اس کے لئے مختلف موسم پیدا کرے اور گرمی اور سردی اور بارش کے حالات سے گزارتے ہوئے اس کو ایک مکمل درخت کی صورت میں کھڑا کر دے۔

یہ درخت پوری کائنات سے اس طرح ہم آہنگ ہوتا ہے کہ کہیں بھی ماحول کی دوسری چیزوں سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ وہ اگر زمین سے پانی لیتا ہے تو خود بھی زمین سے لی ہوئی رطوبت کو اپنے پتوں کے ذریعہ خارج کر کے بارش کے عمل میں معاون بنتا ہے۔ وہ اگر زمین سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے تو خود بھی اپنے پتوں اور پھولوں کو زمین پر گرا کر اس کی زرخیزی میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ اگر ہوا سے کاربن ڈائی آکسائڈ لیتا ہے تو ایک اور مفید چیز آکسیجن کی صورت میں اسے لوٹا دیتا ہے۔ وہ کائنات سے الگ ہوتے ہوئے پوری کائنات سے اس طرح جڑا ہوا ہوتا ہے کہ کسی چیز سے بھی کبھی اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

درخت سایہ تلاش کرنے والے کے لئے سایہ مہیا کرتا ہے۔ وہ اپنے پاس سے گزرنے والوں کے لئے مہک اور سرسبز منظر کا تحفہ پیش کرتا ہے۔ جو شخص اس سے غذا حاصل کرنا چاہے اس کے لئے اس کے پاس لذیذ پھل موجود ہوتا ہے۔ حتی کہ جو لوگ اس کو کاٹ ڈالتے ہیں ان کو بھی وہ لکڑی مہیا کرتا ہے جس سے وہ اپنی مختلف تمدنی ضرورتوں کو پوری کریں۔ جب بھی تجربہ کا کوئی لمحہ آتا ہے تو درخت عین وہی ثابت ہوتا ہے جس کی اس سے امید کی گئی تھی۔

ان سب کے ساتھ درخت ایک ایسا وجود ہے جو زمین میں اپنی جڑیں داخل کر کے خود اپنے بل پر کھڑا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ درخت کا تقریباً نصف حصہ سطح زمین کے نیچے ہوتا ہے اور نصف حصہ سطح زمین کے اوپر۔ وہ زمین کی تہوں میں اس طرح گڑا ہوا ہوتا ہے کہ کوئی اس کو اکھاڑ نہ سکے اور فضا میں اس طرح بلند ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں سے بے روک ٹوک اپنا رزق حاصل کرے۔

قرآن میں مومن کی مثال درخت سے دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو کن صفات کا حامل ہونا چاہئے۔ مومن وہ ہے جس کے اندر وہی صفتیں انسانی سطح پر موجود ہوں جو درخت کے اندر مادی سطح پر پائی جارہی ہیں۔ مومن کو وہی کام شعور کے تحت کرنا ہے جس کو درخت طبعی قانون کے تحت انجام دے رہا ہے۔ مومن کو خود اپنے ارادہ سے اسی سرسبز دنیا کی تخلیق کرنی ہے جس کو درخت نظام قدرت کی پابندی میں جبراً وجود میں لاتا ہے۔

عام درخت مٹی کے اندر سے نکلتا ہے۔ مومن کا درخت روحانیت کی ربانی زمین پر اگتا ہے۔ ایک دنیا کے مادی اجزاء سے بنتا ہے اور دوسرا عالم آخرت کے جنتی اجزاء سے۔ عام درخت مادی دنیا کا درخت ہے تو مومن انسانی دنیا کا درخت۔

درخت ایک نمو پذیر وجود ہے، اسی طرح مومن بھی ایک نمو پذیر وجود ہے۔ مومن وہ انسان ہے جو ربانی فکر کی بنا پر اس قابل ہو جاتا ہے کہ پوری کائنات اس کے لئے معرفت کا دسترخوان بن جائے۔

بھاری قیمت

۲۰۰۰ء میں جو انوکھے انکشافات ہوئے ان میں شاید سب سے انوکھا انکشاف وہ تھا جس کو میچ فکسنگ (match-fixing) کہا جاتا ہے۔ یعنی کھیل کے مقابلہ میں ہار جیت کو پیشگی طور پر طے کر لینا اور اس کے معاوضہ میں بڑی بڑی رقمیں وصول کرنا۔ اس سلسلہ میں جن کھلاڑیوں کے نام بار بار میڈیا میں آئے ہیں ان میں سے ایک ساؤتھ افریقہ کا کرکٹ کیپٹن ہانسی کرونیا (Hansie Cronje) ہے۔

میچ فکسنگ کا یہ راز کھل گیا اور دوسرے بہت سے کھلاڑیوں کی طرح ھانسی کرونیا بھی قانون کی پکڑ میں آ گیا۔ ماہرین نے اس سے زبردست پوچھ گچھ (interrogation) کیا۔ شروع میں اس نے اپنے کو بچانے کی کوشش کی مگر آخر کار مجبور ہو کر اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ ھانسی کرونیا اس سے پہلے کھیل کی دنیا میں ہیرو بنا ہوا تھا۔ مگر اس انکشاف کے بعد اچانک وہ زیرو ہو گیا۔ اس کی دولت اور عزت اور اس کا مستقبل سب کچھ اچانک خاک میں مل گیا۔ اب وہ اتنے زبردست حزن اور مایوسی (depression) کا شکار ہوا کہ اس کے نفسیاتی ڈاکٹر آین لوئس (Ian Leuis) کا کہنا ہے کہ اندیشہ ہے کہ ھانسی کرونیا کا حافظہ گہرے طور پر متاثر ہو جائے اور آئندہ وہ معتدل زندگی گزارنے کے قابل نہ رہے۔

ھانسی کرونیا نے اپنی اس بھیانک غلطی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب مجھ سے اس قسم کی پیش کش کی گئی تھی، کاش میں نے اسی وقت اس سے انکار کر دیا ہوتا۔ اس نے کہا کہ ایک سادہ نہیں میری زندگی کو کہیں زیادہ پرسکون بنا دیتا اور میری وہ حالت نہ ہوتی جس میں کہ اب میں مبتلا ہوں:

A simple no would have made my life a whole lot easier and I wouldn't be in the situation I am in now. (TOI, 22 June, 2000)

آج کی دنیا کے اس واقعہ میں اُس سنگین تر واقعہ کی ایک جھلک ہے جو کل کے دن آخرت میں لوگوں کے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے موجودہ امتحان کی زندگی میں خدا

کے حکم کو توڑا ہوگا، جنھوں نے دنیوی ترغیبات (temptations) کی خاطر آخرت کے تقاضوں کو نظر انداز کیا ہوگا، جنھوں نے ابدی فائدوں کے مقابلہ میں وقتی فائدوں کو ترجیح دی ہوگی، وہ جب آخرت میں اپنی اس غلطی کا بھیانک انجام دیکھیں گے تو اچانک ان کا سارا قلعہ دھڑام سے گر جائے گا۔ وہ کہیں گے کہ کاش ہم نے وقتی محرومی کو برداشت کر لیا ہوتا تو ہم کو ابدی تباہی اور محرومی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

قرآن میں انسانیت کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ہرگز نہیں، بلکہ تم چاہتے ہو جلد آنے والی (عاجلہ) کو۔ اور تم چھوڑتے ہو دیر میں آنے والی (آخرت) کو۔ (القیامہ ۲۰۔۲۱) اسی طرح قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: یہ لوگ جلدی ملنے والی چیز (عاجلہ) کو چاہتے ہیں۔ اور انہوں نے چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو (الدہر ۲۷)

موجودہ دنیا میں آدمی کے سامنے جب کوئی خوشنما چیز آتی ہے تو وہ اس کی طرف اتنا زیادہ راغب ہوتا ہے کہ وہ نہیں (no) کہنے کی ہمت نہیں کر پاتا، وہ اس میں ملوث ہو جاتا ہے۔ مگر موت کے بعد وہ دیکھے گا کہ ایک انتہائی وقتی خوشی کی قیمت اس کو ابدی محرومی کی صورت میں ادا کرنی پڑے گی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتا۔ مگر اس وقت وہ اپنی اس نادانی پر افسوس کرے گا مگر اس وقت افسوس کرنا اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

صحیح طرز فکر

میں نے تقریباً ہر موضوع کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِس مطالعہ کے دوران میں اُس موضوع تک پہنچا جس کو آرٹ آف تھنکنگ (art of thinking) کہا جاتا ہے۔ اس پر میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ عمل تفکیر (thinking process) کو درست طور پر چلانے کے لئے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آدمی یہ جانے کہ سوچنے کا درست طریقہ کیا ہے۔ ورنہ برسوں کی ذہنی کاوش کے باوجود وہ صرف کنفیوزن (confusion) میں مبتلا رہے گا۔ اگر چہ اپنے خیال کے مطابق وہ یہی سمجھے گا کہ میں سوچنے کا عمل کر رہا ہوں۔ کسی معاملہ میں صحیح نقطہ نظر تک پہنچنے کی یہ سب سے زیادہ ضروری شرط ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ آدمی کو یہ جاننا چاہئے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے جس کو اس نے خود نہیں بنایا ہے بلکہ کسی اور نے اس کو اپنے نقشہ کے مطابق بنایا ہے۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق یہ بنانے والا خدا ہے۔ اور خدا نے غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ علم ایک کثیر خزانہ ہے جس کا صرف قلیل حصہ انسان کو دیا گیا ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۵)

لمبی مدت کے تجربہ کے بعد جدید سائنس نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

یہاں میں ایک متقابل مثال دوں گا۔ ہم جانتے ہیں کہ ۵ ہزار سال کی مسلسل کوشش کے باوجود فلسفہ کا کوئی حاصل (achievement) نہیں۔ اس کے برعکس سائنس نے دنیا کو بہت زیادہ چیزیں دی ہیں۔ اس فرق کی واحد وجہ یہ ہے کہ فلسفہ نے اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا کہ وہ صرف جزئی علم تک پہنچ سکتا ہے، اس کو جزئی علم پر قناعت کرتے ہوئے کلی رائے قائم کرنا ہے۔ اس کے برعکس سائنس نے علمی قناعت کا یہی طریقہ اختیار کر لیا۔ اسی کا نتیجہ وہ تمام مادی ترقیاں ہیں جو موجودہ زمانہ میں سائنس کے ذریعہ انسان کو ملیں۔

فلسفہ اور سائنس کے اس فرق کو بطور علامت لیتے ہوئے میں کہوں گا کہ جو آدمی اپنے تھنکنگ پراسس (thinking process) کو کامیابی کے ساتھ منزل تک پہنچانا چاہتا ہے، اس کو چاہئے کہ وہ ''فلاسفر'' نہ بنے بلکہ وہ ''سائنٹسٹ'' بنے۔ یعنی فطرت کے نظام کے مطابق، وہ جن باتوں کو جان سکتا ہے ان کو وہ جاننے کی کوشش کرے۔ اور جن باتوں کو وہ اپنی محدودیت کی بنا پر نہیں جان سکتا ان کے بارے میں وہ اجمالی علم پر قناعت کرے۔ اسی حقیقت کو ایک عالم نے ان الفاظ میں بیان کیا: ابھموا ما ابھمه الله (جس چیز کو اللہ نے مبہم رکھا تم بھی اس کو مبہم رکھو)

علم کے دو پہلوؤں میں فرق کے اصول کو ملحوظ رکھنے کی یہی واحد تدبیر ہے جو آدمی کو کنفیوزن (confusion) سے بچا سکتی ہے جو کہ صحیح نتیجہ فکر تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جو آدمی اس حقیقت کو جانے کہ کنفیوزن کیا ہے اور رائٹ تھنکنگ (right thinking) کیا، اس نے گویا وہ چیز پالی جو موجودہ دنیا میں علم کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔

صحیح رائے تک پہنچنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی ظاہر (appearance) اور حقیقت (reality) میں فرق کرے۔ وہ صرف گہرے تجزیہ کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کرے۔ اس کی ایک مثال کچھ لوگوں کی وہ بات ہے جو اکثر نقل کی جاتی ہے۔ کچھ لوگ قرآن کو ڈسکریڈٹ کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ قرآن ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں اترا جب کہ لوگ سادہ قسم کی فطری زندگی گزارتے تھے۔ اب بڑی بڑی ترقیاں ہو چکی ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ انسان کے لئے قدیم قرآن میں اپیل نہیں ہو سکتی۔

یہ ایک سطحی بات ہے۔ آج جو ترقی ہوئی ہے وہ تمام تر ٹکنکل ترقی ہے اور قرآن کا خطاب انسانی فکر سے ہے نہ کہ فنی ترقیات سے۔ جہاں تک انسانی ذہن کے لیول کا تعلق ہے وہ آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ نفسیاتی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ پانچ ہزار سال پہلے یونان کے فلسفیوں کا جو درجہ فکر تھا وہ عین وہی تھا جو آج کے انسان کا درجہ فکر ہے۔ اس اعتبار سے آج کے انسان اور ماضی کے انسان میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن ایک نظریاتی کتاب ہے۔ اس کا خطاب فطرت انسانی سے ہے۔ قرآن کے پیغام کو

سمجھنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ذہنی استعداد (intellectual competence) ہے نہ کہ فنی استعداد (technical competence)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا انسان جس طرح قرآن کا مخاطب بن سکتا تھا، ٹھیک اسی طرح آج کا انسان بھی قرآن کا مخاطب بن سکتا ہے۔ کیوں کہ دونوں کے معیار ذہنی میں کوئی فرق نہیں۔

یہاں میں ایک مثال دوں گا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان کی جو فکری سطح ہے، کسی کمی کے بغیر وہی فکری سطح پیغمبر کے زمانہ کے لوگوں کی بھی تھی۔ مثلاً دور جدید کے ایک مغربی مفکر ولیم رالف انگ (William Ralph Eng) کا قول ہے جو گویا آج کے ایک تعلیم یافتہ انسان کی ذہنی سطح کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس نے کہا:

The wise man is he who knows the relative value of things.

ٹھیک یہی بات ایک صحابیٔ رسول حضرت عمر فاروق نے اپنے الفاظ میں اس طرح کہی: **لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر ولکنه الذی یعرف خیر الشرین**۔ (عقل مند وہ نہیں جو خیر کو اور شر کو جانے بلکہ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کمتر شر (lesser evil) کون سا ہے۔ یہ دونوں مثالیں بتاتی ہیں کہ معیار ذہن کے اعتبار سے آج کے انسان اور ساتویں صدی کے انسان میں کوئی فرق نہیں۔ پھر جو قرآن ساتویں صدی کے انسان کو اپیل کر سکتا تھا وہ موجودہ زمانہ کے انسان کو کیوں اپیل نہیں کرے گا۔

آخری بات یہ کہ فکرِ صحیح کی کلید یہ ہے کہ آدمی منتشر ذہن اور درست ذہن کے فرق کو جان لے:

To know the difference between a sound mind
and confused mind is key to right thinking.

دونکاتی پروگرام

مغربی ملکوں میں اس وقت دس ملین سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں۔ ان مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مشترک مسئلہ صرف ایک ہے ـــــ سیکولر سوسائٹی میں وہ اپنی اسلامی پہچان کو کیسے باقی رکھیں۔ وہ اپنی نسلوں کے دینی تحفظ کو کس طرح یقینی بنائیں۔ موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا یہ حل نہیں کہ اس کے بارے میں مغربی ملکوں کے مسلمان وہاں احتجاج کریں یا مطالباتی مہم چلائیں۔ اس قسم کی کوئی بھی کوشش وہاں اکثریت کے لئے ناقابل قبول ہوگی۔ وہ مسئلہ میں اضافہ تو کرسکتی ہے مگر وہ مسئلہ کا حل نہیں بن سکتی۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں مغربی ملکوں کے مسلمان حقیقت پسندانہ انداز اختیار کریں۔ وہ ناممکن کے پیچھے اپنی طاقت ضائع کرنے کے بجائے اس چیز کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائیں جو موجودہ حالات کے باوجود ان کے لئے ممکن ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ایک نتیجہ خیز فارمولا درکار ہے۔ یہ فارمولہ واضح طور پر قرآن میں موجود ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن ہمیں دونکاتی فارمولہ دیتا ہے جو قابل عمل بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔

اس دونکاتی فارمولے کا پہلا جزء یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو خارج رخی کوششوں (external oriented efforts) کے بجائے داخل رخی کوششوں پر اعتماد کرنا چاہئے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصر میں بنی اسرائیل کے لئے اسی نوعیت کے مسائل پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے پیغمبر نے اللہ کی رہنمائی کے تحت انہیں یہ ہدایت دی کہ: **اجعلوا بیوتکم قبلۃً** (یونس ۸۷) یعنی تم لوگ اپنے گھروں کو اپنا قبلہ بنالو۔

اپنے گھروں کو اپنا قبلہ بنانے کا مطلب یہ تھا کہ اپنے گھروں کو اپنا مرکز عمل بنالو۔ دین کے تعلق سے تمہارے جو فرائض ہیں ان کو اپنے گھر کے اندر انجام دو۔ اگر تم اعلان کے ساتھ اپنی دینی ذمہ داری کو ادا نہیں کرسکتے تو اعلان کے بغیر اس کو انجام دینے کا نظام بناؤ۔

اس اصول کی روشنی میں مغربی ملکوں میں آباد مسلمانوں کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنے دینی تحفظ کا

جو کام خارجی نظام کی مدد سے انجام نہیں دے سکتے اس کو وہ اپنے داخلی انتظام کے تحت انجام دیں۔ وہ اپنی نسلوں کے دینی تحفظ کا انتظام کریں۔ وہ کیسٹ اور لٹریچر اور تقریروں کے ذریعہ اس تعلیمی اور تربیتی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اس پروگرام کا دوسرا جزء دعوت ہے۔ دعوت اہل اسالم کے لئے خارجی تبلیغ کے ساتھ داخلی تحفظ کا ذریعہ بھی ہے۔ قرآن میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ تم اس چیز کو لوگوں تک پہنچا دو جو اللہ کی طرف سے تمہارے اوپر اتاری گئی ہے۔ اس دعوتی عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تم کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ (المائدہ ٦٧)

دعوت کیا ہے۔ دعوت انسان کو دین فطرت کی طرف بلانا ہے۔ دعوت گویا لوگوں کو خود ان کے اپنے دین سے روشناس کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت کے اندر تسخیری طاقت موجود ہے۔ دعوت اہل اسلام کے لئے خارجی حالات کے مقابلہ میں تحفظ کا طاقتور ذریعہ ہے۔ دعوت مسئلہ کو نظر انداز کر کے خود مسئلہ پیدا کرنے والے کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ اور تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ طریقہ ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔

موجودہ حالات میں مغرب میں آباد مسلمانوں کے لئے قرآن سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ یہی ہے۔ یہی دو نکاتی پروگرام ان کے مسئلہ کا حل ہے۔ ''گھروں کو مرکز عمل بنانا'' اگر حالات کے مقابلہ میں دفاعی تدبیر ہے تو دعوۃ ورک گویا حالات کے مقابلہ میں عملی اقدام۔

پہلے اصول کی ایک عملی مثال جدید ترکی ہے جہاں سخت قسم کی خارجی ناموافقت کے باوجود مسلمان اپنے دین کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے۔ دوسرے اصول کی ایک عملی مثال تیرہویں صدی عیسوی میں پیش آنے والا تاتاریوں کا واقعہ ہے جب کہ بظاہر ایک مخالف قوت کو دعوت کے ذریعہ شاندار طور پر اپنا حامی بنالیا گیا۔

ہریانہ کا سفر

سرودھرم ایکتا مشن (پانی پت) کے دو نمائندے اپریل ۲۰۰۰ کے آخر میں مجھ سے دہلی میں ملے۔ ان کے نام یہ ہیں: مسٹر بلراج ملک (ایڈوکیٹ) اور مسٹر وجے آنند۔ ان کی سنستھا کا انگریزی نام یہ ہے: مومنٹ فار یونائیٹڈ ورلڈ۔ پانی پت کے لئے ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے:

Off: 65404, Mobile: 98120-30481

ان لوگوں سے پہلی ملاقات کافی لمبی تھی اور دلچسپ بھی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ مختلف مذہب کے لوگ مل جل کر رہیں۔ ہر طرف پیار محبت کا ماحول ہو۔ انہوں نے کہا کہ آخر سب مذہب ایک ہی ہیں۔ سب ایک ہی سچائی کو بتاتے ہیں پھر آپس کا جھگڑا کس لئے۔ میں نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے۔ مگر ہم آہنگی کے اس مقصد کا صحیح فارمولا انسانی یکسانیت ہے نہ کہ مذہبی یکسانیت۔ ''تمام مذاہب ایک ہیں یہ ایک خلاف واقعہ نظریہ ہے''۔ کیوں کہ مختلف مذاہب کی تعلیمات میں ایسے واضح فرق ہیں کہ کوئی آدمی سنجیدگی کے ساتھ ان سب کو ایک نہیں کہہ سکتا۔ البتہ تمام انسان ایک ہیں'' بالکل درست بات ہے، اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ انسانی یکسانیت کے اسی اصول کی بنیاد پر سماجی اتحاد قائم کیا جاسکتا ہے۔

میں نے کہا کہ ایک سماج میں کچھ لوگ سیاہ فام ہوں اور کچھ لوگ سفید فام۔ ایسے سماج میں اتحاد قائم کرنے کے لئے یہ مہم چلائی جائے کہ سیاہ رنگ اور سفید رنگ دونوں ایک ہیں تو کبھی اتحاد قائم نہیں ہوگا۔ کیوں کہ دونوں رنگوں میں واضح فرق ہے۔ اس کے عکس اگر یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرائی جائے کہ دونوں قسم کے لوگ یکساں طور پر انسان ہیں، تو نہایت آسانی سے ان کے درمیان اتحاد قائم ہو جائے گا، کیوں کہ انسانی یکسانیت ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس معاملہ کی مزید تفصیل کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ''تمام مذاہب ایک ہیں'' کا فارمولا لمبے تجربہ کے بعد اس طرح ناکام ہو چکا ہے کہ اب اس کا مزید تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ سماجی اتحاد کا یہ نظریہ سب سے پہلے بادشاہ اکبر (وفات ۱۶۰۵) نے پیش کیا مگر اقتدار کی مکمل حمایت کے باوجود وہ ناکام ہو گیا۔ پھر ڈاکٹر بھگوان داس (وفات ۱۹۵۸) نے ساری عمر کی جد وجہد کے بعد

ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا نام تھا وحدۃ المذاہب (Essential Unity of All Religions) مگر ان کی یہ انسائیکلو پیڈیائی مہم بھی مکمل طور پر ناکام ہوگئی۔ اس کے بعد مہاتما گاندھی (وفات ۱۹۴۸) نے اپنی عوامی مقبولیت کا پورا زور اس نظریہ کے حق میں لگا دیا۔ مگر وہ بھی سراسر ناکام رہے۔ اسی طرح کے سیکڑوں بڑے بڑے دماغ سماجی اتحاد کے اس فارمولے کو لے کر اٹھے مگر وہ اپنے مقصد میں ایک فی صد بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

پھر ان لوگوں نے کہا کہ اب آپ ہی بتائیے کہ سماجی اتحاد کا صحیح فارمولا کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس مقصد کے لئے صحیح فارمولا صرف ایک ہے، اور وہ وہی ہے جس کو ہم اب بھی بڑے پیمانہ پر استعمال کر رہے ہیں، اور وہ ہے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرنا۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ مذہبی اتحاد کا صحیح فارمولا باہمی اعتراف (mutual recognition) نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح فارمولا باہمی احترام (mutual respect) ہے۔

سرودھرم ایکتا مشن کے مذکورہ دونوں ذمہ دار میری باتوں کو غور سے سنتے رہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں کی رائے اس کے بارے میں کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں آپ کی بات سے ۸۰ فیصد اتفاق ہے۔ وہ لوگ مجھے کرنال میں ہونے والے ایکتا مشن کے اجلاس (۷ مئی ۲۰۰۰) میں چیف گیسٹ کے طور پر شرکت کی دعوت دینے آئے تھے۔ میں نے کہا کہ جب آپ لوگوں کو میری بات سے پورا اتفاق نہیں ہے تو ایسی حالت میں آپ کے اجلاس میں شریک ہونا میرے لئے ممکن نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ مسئلہ بے حد اہم ہے۔ آپ لوگ اس پر مزید غور کیجئے، اس کے بعد مجھے بتائیے۔ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ چند دن کے بعد ان کا ٹیلی فون آیا کہ ہم نے اپنی کمیٹی میں آپ کی بات کو رکھا اور اس پر کافی سوچ بچار کیا۔ آخر کار ہمارے تمام ممبروں نے آپ کی بات سے پورا اتفاق کر لیا ہے۔ اب آپ کو ہمارے اجلاس میں شرکت پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ میں نے ان کی دعوت کو منظور کر لیا۔

پروگرام کے مطابق ۷ مئی ۲۰۰۰ کی صبح کو دہلی سے کرنال کے لئے روانگی ہوئی۔ دہلی سے

کرنال کا فاصلہ ۱۲۵ کیلومیٹر ہے۔ یہ فاصلہ بذریعہ روڈ طے ہوا۔

اس سفر کا پہلا تجربہ بہت خوشگوار تھا۔ کل تک یہاں سخت گرمی کا موسم چل رہا تھا۔ ۷ مئی کی صبح کو ۷ بجے جب ہماری گاڑی دہلی کی سڑکوں پر آگے بڑھ رہی تھی تو اچانک فضا میں بادل گھر آئے اور بارش ہونے لگی۔ مزید خوشگوار بات یہ تھی کہ بارش زیادہ لمبی نہیں ہوئی بلکہ کچھ دیر بارش ہوئی اور پھر تھم گئی۔ گویا کہ وہ صرف موسم کو خوشگوار بنانے کے لئے آئی تھی۔ مجھے مولانا اقبال احمد سہیل (تاریخ وفات ۱۹۵۵) کا ایک مصرعہ یاد آیا:

برس کے بادل جو کھل گیا ہے تو لوگ خوشیاں منا رہے ہیں

دہلی سے نکل کر ہماری گاڑی ہریانہ کے علاقہ میں داخل ہوئی۔ اب ہم لوگ نیشنل ہائی وے نمبر ایک پر چل رہے تھے۔ یہ ہمارے ملک کی سب سے اہم سڑک مانی جاتی ہے، لیکن اس کا تقابل اگر امریکہ اور ترقی یافتہ مغربی ملکوں سے کیا جائے تو وہ بہت کمتر معلوم ہوگی۔

سڑک، ٹیلی فون اور اسی طرح کے دوسرے وسائل کو انفراسٹرکچر (infrastructure) کہا جاتا ہے۔ میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا کہ پچاس سال سے زیادہ مدت گزرنے کے باوجود ہندستان ایک ترقی یافتہ ملک نہ بن سکا جب کہ اسی مدت میں بہت سے ملک جدید معیار کے مطابق، ترقی یافتہ ملک بن چکے ہیں۔ حتیٰ کے سنگاپور جیسے چھوٹے ملک بھی۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد جو بات میری سمجھ میں آئی ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے ملکوں نے سب سے زیادہ زور بہترین انفراسٹرکچر پر دیا۔ جب کہ ہمارے یہاں اس کے بجائے نظریاتی کٹرپن (ideological fanaticism) پر سارا زور دیا گیا۔

میں اپنے مطالعہ سے یہ سمجھا ہوں کہ ہر انسان پیدائشی طور پر ترقی کرنا اور آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ ہر انسان کے اندر بے پناہ جذبہ ہے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو استعمال کر کے اپنے حوصلوں کی تکمیل کرے اور بڑے بڑے کارنامے انجام دے۔ ایسی حالت میں انسان کو ترقی کے لئے کسی نظریہ (ideology) کی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے وہ سہولتیں (facilities) فراہم کی جائیں جن کو استعمال کر کے وہ اپنے فطری حوصلوں کی تکمیل کر سکیں۔ مثلاً تعلیم کے اچھے

ادارے، حوصلہ بڑھانے والا ماحول، عمدہ سڑکیں، ٹیلی فون اور بجلی کی عمدہ سہولت، معاون انتظامیہ، سرکاری پابندیوں سے آزاد ماحول، ہر آدمی کے لئے ترقی کے یکساں مواقع، صحت سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی آسان دستیابی، امن اور تحفظ کا ماحول وغیرہ۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں مختلف قسم کے نظریاتی جنون کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی کام درست طور پر نہ ہوسکا۔ البتہ دوسرے غیر متعلقین عنوانات پر دھوم مچائی جاتی رہی۔

۱۲۵ کیلومیٹر کا یہ سفر غیر متوقع طور پر نہایت خوشگوار موسم میں ہوا۔ ہلکی بارش، آسمان میں بادلوں کی ٹکڑیاں، اس قسم کے مناظر یاد دلا رہے تھے کہ ہندستان ایک ایسا ملک ہے جہاں قدرت نے پانی کی نعمت کو وافر مقدار میں فراہم کیا ہے۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ آج کل ہمارے ملک کا تقریباً ایک تہائی حصہ پانی کی شدید کمی کی زد میں ہے۔ بہت سے مقامات پر انسان سے لے کر مویشی اور فصلوں تک سب پانی کی کمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس کا سبب قدرت نہیں ہے بلکہ ہماری انتظامی نا اہلی ہے۔ ہندستان میں کثرت سے بارشیں ہوتی ہیں مگر اس پانی کا صرف چھ فیصد حصہ ہمارے حصہ میں آتا ہے۔ باقی سارا پانی بہہ کر سمندروں میں جا گرتا ہے۔

شہری علاقوں میں آج کل ایک نئی مصیبت یہ سامنے آئی ہے کہ زمینی پانی کی سطح خطرناک حد تک نیچے چلی گئی ہے۔ دہلی بھی انہیں شہروں میں شامل ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ حالیہ برسوں میں نہایت غیر منصوبہ بند انداز میں شہروں کو سیمنٹ کنکریٹ کا جنگل بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب بارش ہوتی ہے تو پانی کا بہت کم حصہ زمین میں جذب ہو کر نیچے پہنچتا ہے۔ اس کا بڑا حصہ بہہ کر باہر نکل جاتا ہے۔ قدرت نے ہندستان کے ساتھ اتنی زیادہ فیاضی کی تھی کہ یہاں کبھی پانی کی کمی نہ ہو۔ مگر فطرت کے نظام کو مصنوعی اسکیموں کے ذریعہ بگاڑ دیا گیا جس کا نتیجہ پانی کی بھیانک قلت کی شکل میں برآمد ہوا۔

ہماری پہلی منزل پانی پت تھی۔ ہم لوگ پانی پت میں داخل ہوئے تو سڑک کے دونوں طرف خوبصورت مکانات کا سلسلہ دکھائی دیا۔ یہ پچھلے کچھ برسوں کا کرشمہ ہے۔ پانی پت میں ہینڈ

لوم اور اون کا بزنس بہت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس خوشحالی کے اثرات شہر میں ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔

پانی پت میں ہم لوگ مسٹر بلراج ملک ایڈوکیٹ کی رہائش گاہ پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرے۔ وہ سرودھرم ایکتا مشن کے جنرل سکریٹری ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مشن آپ کے لئے ایک وقتی مشن ہے یا وہ آپ کی پوری زندگی کا مشن ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو یہ سوچ کر یہاں آئے ہیں کہ ـــــ منزل دور ہے اور ہمیں چلتے ہی رہنا ہے۔ میں نے کہا کہ یہی سچی مشنری اسپرٹ ہے۔ مشن ساری عمر کے لئے ہوتا ہے، وہ تھوڑے دن کے لئے نہیں ہوتا۔

پانی پت میں کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب نے بات چیت کے دوران کہا کہ یہاں کافی انٹرنیشنل تھنکنگ پائی جاتی ہے۔ یہاں کے ایک صاحب نے کہا کہ یہاں کے لوگوں کا انٹر ایکشن ہر روز ڈائرکٹ یا انڈائرکٹ دوسرے دیشوں سے ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا کاروباری سمبندھ ساری دنیا سے جڑا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اپنے آپ یہ سوچ لوگوں میں آجاتی ہے کہ جب ہم ایک دوسرے پر نربھر ہیں تو پھر آپس میں نفرت کیسی۔

موجودہ زمانہ تیز رفتار کمیونی کیشن کا زمانہ ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ دنیا کے ایک کونے میں ایک ترقی ہو تو فوراً وہ دوسرے کونے میں پہنچ جاتی ہے۔ ایک سائنس داں انسانیت کے فائدے کی ایک چیز دریافت کرتا ہے تو اس کی دریافت بہت جلد تمام انسانوں کے لئے قابل قبول بن جاتی ہے۔

مسٹر بلراج ملک کے کمرہ میں ایک قدرتی منظر کی تصویر فریم کر کے دیوار پر لگی ہوئی تھی اس کے ساتھ یہ جملہ لکھا ہوا تھا:

God is the same yesterday, today and forever.

عام ذوق کے خلاف ان کے کمرے میں مورتی وغیرہ کی تصویر نظر نہیں آئی۔

پانی پت کی سڑکیں دوسرے شہروں سے اچھی دکھائی دیں۔ سڑک پر ٹریفک بھی

ضابطہ کے مطابق تھی۔ آگے والا آسانی سے پیچھے والے کو سائڈ دیتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف خوبصورت مکان اور دفتر دکھائی دئے جو گویا خوشحالی کی علامت تھے۔ میں نے یہاں کے ایک صاحب سے پوچھا کہ پانی پت اور ہریانہ کی ترقی میں عوام کا کتنا ہاتھ ہے اور حکومت کا کتنا۔ انہوں نے کہا کہ ففٹی پرسنٹ عوام کا اور ففٹی پرسنٹ گورنمنٹ کا۔ میں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی گورنمنٹ صرف ففٹی پرسنٹ ہی کرسکتی ہے۔ بقیہ ففٹی پرسنٹ عوام ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ عوام اگر اپنے حصہ کا کام ٹھیک طور پر نہ کریں تو تنہا گورنمنٹ کی مدد کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی۔

نوجوانی کی عمر میں جب میں نے پانی پت کا نام سنا تو اس کے ساتھ جنگی واقعات کی داستانیں شامل تھیں۔ پانی پت کے میدان میں قدیم زمانہ میں کئی جنگیں پیش آئی ہیں۔ پانی پت کا لفظ میرے ذہن میں انھیں خونیں قسم کی یادوں سے جڑا ہوا تھا۔ ۷ مئی کو جب کہ موسم بھی خوشگوار ہو چکا تھا پانی پت کی مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ایک نئے پانی پت کو دریافت کر رہا ہوں۔ حال میں جب میں امریکہ کے شہر فلوریڈا گیا تھا تو وہ مجھے بہت خوبصورت شہر معلوم ہوا تھا۔ جدید پانی پت بھی مجھ کو فلوریڈا کی قسم کا ایک شہر دکھائی دیا۔ میں نے کہا کہ پانی پت مستقبل کے ہندستان کی ایک علامت ہے۔ غالباً اگلے ۲۵ سال میں ہندستان کا نقشہ بالکل بدل چکا ہوگا۔

پانی پت کے ایک تعلیم یافتہ ہندو سے میں نے پوچھا کہ آج کا ہندو نوجوان کس طرح سوچتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ آج کے ہندو نوجوان میں بہت تیزی سے انٹرنیشنل تھنکنگ پیدا ہو رہی ہے۔ اب وہ صرف بھارتی اصطلاح میں نہیں بلکہ گلوبل اصطلاح میں سوچتا ہے۔ میں نے سوچا کہ ۱۹۲۵ میں جن لیڈروں نے ملک کی ترقی کا سب سے بڑا فارمولا ''بھارتیتا'' کی صورت میں دریافت کیا تھا وہ تاریخ کے بارے میں کتنا کم جانتے تھے۔ ۱۹۲۵ سے اب تک کی مسلم قیادت تقریباً پوری کی پوری اسی بھارتیتا کے خلاف ردعمل کا نام ہے۔ مسلمانوں میں کوئی ایسا قائد نہیں اٹھا جو یہ جانتا

ہو کہ تاریخ کا عمل خود ہی بھارتیتا اور ہندوتو جیسے کٹر نظریات کو بلڈوز کر رہا ہے۔ پھر ہمیں اس کے خلاف بے فائدہ سرگرم ہونے کی کیا ضرورت۔ ہمیں خود اپنی تعمیر کے مثبت کام میں لگنا چاہئے، نہ کہ تخریبِ غیر کے منفی کام میں۔

پانی پت سے کرنال تک کا راستہ ایک خوبصورت ماحول میں طے ہوا۔ خوشگوار موسم، کشادہ سڑک اور سڑک کے دونوں طرف دور دور تک کھلے میدان جن میں جگہ جگہ درخت ابھرے ہوئے، اس طرح کے ماحول میں سفر کرتے ہوئے ہم کرنال میں داخل ہوئے۔ کرنال میں بھی ہر طرف اسی طرح ترقی کے مناظر تھے جو پانی پت میں دکھائی دئے۔

کرنال کے اندر چلتے ہوئے ہم مانوسیوا سنگھ کے کیمپس میں داخل ہوئے۔ یہ ہماری پہلی منزل تھی۔ یہ گویا ایک باغ کے اندر ایک وسیع ادارہ تھا جس میں انسانی خدمت کی مختلف سرگرمیاں دکھائی دیں۔ یہاں ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ لوگوں میں باہمی تعاون کا ماحول ہے۔ چنانچہ میں جس پروگرام کے لئے کرنال آیا، اس کا انتظام ایک اور ادارے نے کیا ہے مگر مانوسیوا سنگھ کی طرف سے اس کو بھرپور تعاون دیا گیا۔

سوامی پریم مورتی جی سے ملاقات ایک دلچسپ تجربہ تھی۔ وہ مانوسیوا سنگھ کے ذمہ دار اعلیٰ ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اپنی سنستھا کے بارے میں کچھ بتائیے۔ انہوں نے نہایت سادہ انداز میں کہا کہ ہمارا یہ ماننا ہے کہ بندوں کی سیوا خدائی عبادت ہے۔

سوامی جی سے میں نے پوچھا کہ آنند والے جیون کا راز کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جس کا تار خدا سے جڑ جائے، آنند اسی کے لئے ہے۔ جب خدا کی رحمت ہوتی تبھی کسی انسان کا تار خدا سے جڑ جاتا ہے۔ خدا کی رحمت سب کے لئے ہے۔ وہ برابر سب پر رحمت کر رہا ہے۔ مگر جو خود سے رحمت نہ چاہے اس کو رحمت ملے گی بھی نہیں۔

سوامی پریم مورتی نے اپنی تنظیم مانوسیوا سنگھ کے بارے میں ایک ہندی پمفلیٹ دیا اس میں کچھ اقوال لکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو قول یہ تھے:

''ہر گھٹنا بھگوان کی لیلا ہے''۔

''کار یہ اسی کا سدھ ہوتا ہے جو دوسروں کے کام آتا ہے''۔

میں نے سوامی جی سے پوچھا کہ کوئی سوتر کی بات بتایئے۔انہوں نے ایک لمحہ سوچا، اس کے بعد کہا: ہر سمیہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار رہے۔کیوں کہ جو اللہ تعالیٰ کرتے ہیں وہ صحیح کرتے ہیں۔

مسٹر ستیش گگلانی روٹری کلب کے ممبر ہیں۔وہ ایک تاجر ہیں اور اسی کے ساتھ سماجی ویلفئر کا کام بھی کرتے ہیں۔انہوں نے بتایا کہ پچھلے ۸ سال سے وہ یہ کام کررہے ہیں۔انھوں نے کہا کہ ہم نے ۹ ہزار لوگوں کی بیڑی چھڑائی ، ۹۰۰ لوگوں کی شراب چھڑائی۔ ۴۲ آدمی کا گانجہ اور ہیروئن چھڑائی، وغیرہ۔

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اس میں کامیاب کیسے ہوئے۔انہوں نے کہا کہ ہر آدمی فطری طور پر جینا چاہتا ہے اور اچھی طرح جینا چاہتا ہے۔وہ ایک بری عادت میں پھنس گیا ہم اس کو اس سے نکالتے ہیں۔کاؤنسلنگ (counselling) اور ترغیب (persuasion) کے ذریعہ اس کا ذہن بناتے ہیں۔اس کو دوائیں دیتے ہیں۔حتی کہ اس کے گھر کے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح اس معاملہ میں ہماری مدد کریں۔انہوں نے بتایا کہ جدید سائنس کی دریافت کردہ حقیقتوں کو ہم انہیں آسان انداز میں سمجھاتے ہیں کہ کس طرح نشہ انسان کے پورے سسٹم کو خراب کردیتا ہے۔اور اس کو جیتے جی بیکار بنادیتا ہے۔اس طرح جب اس کو ہماری بات سمجھ میں آجاتی ہے تو وہ اس طرح اپنی عادت چھوڑنے پر راضی ہوجاتا ہے۔ہم نے ۸ سال کی مدت میں ۴۰ ہزار آدمیوں پر کام کیا ہے۔کچھ لوگوں نے جزئی طور پر نشہ چھوڑ دیا اور تقریباً ۲۰ پرسنٹ لوگوں نے کلّی طور پر۔

مولانا محمد الیاس صاحب سے ملاقات ہوئی۔وہ پانی پت کے ایک مدرسہ میں مہتمم ہیں۔اس مدرسہ کا نام الجامعۃ الاسلامیہ دارالعلوم ہے۔اس ادارہ میں طلبہ کی تعداد ۱۱۵ ہے۔اس مدرسہ کی چھ شاخیں مختلف دیہاتوں میں قائم ہیں۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد پانی پت کا علاقہ مسلمانوں سے بالکل خالی ہوگیا تھا۔پانی پت میں صرف ایک مولانا لقاء اللہ صاحب باقی رہ گئے تھے۔مگر مولانا محمد

الیاس صاحب نے بتایا کہ اب پانی پت میں ۲ لاکھ سے زیادہ مسلمان آباد ہیں۔ یہی معاملہ پورے ہریانہ اور پنجاب کا ہوا۔

۱۹۴۷ میں کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ یہ علاقہ دوبارہ مسلمانوں سے آباد ہوگا۔ مگر تاریخ ہمیشہ انسانوں کے مزعومات کو رد کر دیتی ہے۔ اسی کی ایک مثال یہ علاقہ بھی ہے۔

مولانا محمد الیاس صاحب سے میں نے پوچھا کہ آپ مدرسہ کے کام سے جڑے ہوئے ہیں اور اسی کے ساتھ آپ تبلیغ سے بھی جڑے ہوئے ہیں اپنے کچھ تجربات بتائیے۔ انہوں نے اپنے تجربات بتاتے ہوئے ایک دلچسپ بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ آج کل سب سے بڑا جہاد مدرسہ چلانا ہے۔ اگر آپ تبلیغ میں جائیں تو ہر جگہ آپ کا اعتراف ہوگا۔ ہر جگہ آپ کی ضیافتیں ہوں گی۔ ہر جگہ آپ کا استقبال کیا جائے گا۔ ہر جگہ قیام اور دوسری ضرورتوں کا اچھا انتظام ملے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ کہیں جائیں اور وہاں لوگوں کے سامنے مدرسہ کی بات کریں تو لوگ سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کریں گے، منھ پھیر کر ادھر ادھر چلے جائیں گے۔ مدرسہ کے کام میں بے عزتی ملتی ہے جب کہ تبلیغ کے کام میں جائیے تو وہاں آپ کو عزت ملے گی۔ انہوں نے کہا کہ اس زمانہ میں جس کو جہاد کا ثواب لینا ہو وہ ایک مدرسہ چلائے۔

۷ مئی کو ساڑھے دس بجے وہ سمّیلن شروع ہوا جس کے لئے میں کرنال آیا تھا۔ یہ سمیلن مانو سیوا سنگھ کے ہال میں ہوا۔ یہ ادارہ ایک وسیع پارک جیسے ماحول میں قائم ہے۔ صبح کی بارش کی وجہ سے موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ ہال کی تمام کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ یہ سب پڑھے لکھے لوگ تھے۔ حاضرین میں ۹۹ فیصد ہندو تھے۔ میرے سوا صرف دو مسلمان اور دو سردار نظر آئے۔ سب سے مختصر تقریر سردار راؤ گروبخش سنگھ کی تھی۔ یہاں مقررین کو دس منٹ کا وقت دیا گیا تھا۔ سردار گروبخش سنگھ کو بھی دس منٹ دیا گیا مگر وہ صرف ایک منٹ کے لئے بولے۔ انہوں نے کہا کہ: منُش کی ایک ہی ذات، اس کو پہچانو۔ (انسان سب ایک ہیں۔ اس حقیقت کو جانئے)

مجھے اس سمّیلن میں چیف گیسٹ کے طور پر بلایا گیا تھا۔ اپنی آدھ گھنٹہ کی تقریر میں میں نے کہا

کہ موجودہ زمانہ میں جو مسائل نظر آتے ہیں ان کا پیدا کرنے والا انسان ہے۔ جنگ کون چھیڑتا ہے، انسان۔ صنعتی کثافت سے پانی اور فضا کو کون آلودہ کرتا ہے، انسان۔ کرپشن کے ذریعہ قومی معیشت کو کون تباہ کرتا ہے، انسان۔ سیاسی طاقت کو فسادی طاقت میں کون تبدیل کرتا ہے، انسان۔ اس لئے اصل مسئلہ نظام (سسٹم) کو بدلنے کا نہیں، بلکہ انسان کو بدلنے کا ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنایا جائے۔

مذہب کا اصل مقصد یہی ہے۔ مذہب کا نشانہ انسان کو انسان بنانا ہے۔ انسان کی اصلاح ہو جائے تو بقیہ چیزوں کی اصلاح اپنے آپ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں میں نے اسلامی تعلیمات سے کچھ مثالیں پیش کیں۔ اور بتایا کہ اسلام کا اصل نشانہ فرد کی اصلاح ہے۔ کسی حکومت یا سسٹم کو نشانہ بنا کر اس کے خلاف گن کلچر چلانا اسلام نہیں۔

میں نے کہا کہ اسلام اور حب وطنی میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ اسلام دین فطرت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت کی ہر بات اپنے آپ اسلام میں شامل ہے، خواہ قرآن وحدیث میں صراحۃً اس کا ذکر ہو یا نہ ہو مثلاً قرآن میں نہیں لکھا ہوا ہے کہ اے مسلمانو، تم اپنے وطن سے محبت کرو۔ مگر وطن کی محبت لکھے بغیر اسلام میں شامل ہے۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ اے مسلمانو، تم اپنی ماؤں سے محبت کرو۔ مگر ماں سے محبت یقیناً اسلام کا ایک حصہ ہے۔ کیوں کہ وہ فطرت کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح وطن سے محبت بھی اسلام کا ایک حصہ ہے کیوں کہ وہ فطرت کا ایک حصہ ہے۔

مسٹر پردیپ کمار ایڈوکیٹ (پانی پت) کرنال کے سمیلن میں موجود تھے۔ انہوں نے میری تقریر کے بارے میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ آپ کی اسپیچ کو سن کر یہ لگا کہ ہم بھی دھارمک ہو سکتے ہیں۔ اب تک ہم سمجھتے تھے کہ دھارمک ہونے کا مطلب ہے جنونی ہونا۔ اس لئے ہم دھرم سے دور ہی رہتے تھے۔ مگر آپ کی باتوں کو سن کر اور آپ کو دیکھ کر اب ہم سمجھے کہ دھرم انسانیت سے پیار کا نام ہے۔ آپ جس دھرم کو پرزنٹ کرتے ہیں اس سے کسی کو بھی نہیں ہو سکتا۔

سمّیلن سے پہلے ہندو جاگیبلس (ٹی وی) نے ایک انٹرویو ریکارڈ کیا ان کے سوالات کا تعلق

زیادہ تر موجودہ حالات سے تھا۔ میں نے کہا کہ میڈیا کے لوگ ہمیشہ منفی خبروں کو نمایاں کرتے ہیں اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر طرف بگاڑ ہی بگاڑ ہے۔ حالاں کہ ان کے سوا بے شمار مثبت خبریں ہیں مگر میڈیا ان کو نمایاں نہیں کرتا۔

میں نے کہا کہ مثال کے طور پر یہ مانو سیوا سنگھ جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے ہیں یہ لوگ رات دن سماجی خدمت اور تعمیری کام میں لگے ہوئے ہیں مگر میڈیا میں میں نے کبھی ان کے بارے میں نہ سنا اور نہ پڑھا۔ اس کا علم مجھے صرف اس وقت ہوا جب کہ میں کرنال آیا اور اس کو براہ راست اپنی آنکھ سے دیکھا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میں کسی حکومت کو مسلمانوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں سمجھتا۔ مسلم کمیونٹی ہو یا کوئی دوسری کمیونٹی، ہر ایک کے مستقبل کا انحصار خود اپنے عمل پر ہوتا ہے۔ خاص طور پر ڈیما کریسی کے زمانہ میں کوئی حکومت نہ کسی کو کوئی چیز دے سکتی ہے اور نہ کسی سے کوئی چیز چھین سکتی ہے۔ اس لئے ہمارے مشن کا سارا زور اس پر ہے کہ ہم مسلمانوں کے اندر تعمیری سوچ پیدا کریں۔

سمّیلن کے بعد پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں اکثر اخباروں کے مقامی نمائندے موجود تھے۔ اکثر سوالات تیز و تند نوعیت کے تھے مگر میں نے ہر سوال کا ٹھنڈے طریقہ سے جواب دیا۔

دہلی کے اردو اخبار (قومی آواز ۸ مئی ۲۰۰۰) میں ان پاکستانی خواتین کے بارے میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس کے مطابق، ''پاکستان کی ایک خاتون صحافی عارفہ نور نے پاکستان سوسائٹی کو طالبان زدہ بنانے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ماضی قریب میں ملاؤں نے فتویٰ دیا تھا کہ عورتوں کو گھر سے باہر نکلتے وقت سر ڈھاکنا چاہئے لیکن پاکستان کی عام عورتوں نے ملاؤں کے اس فتویٰ کو ٹھکرا دیا اور وہ منظّم طاقت کے سامنے عورتوں کو سر ڈھانکنے پر مجبور نہیں کر سکے۔ (صفحہ ۱)

پاکستان کے قیام کے بعد پاکستان میں اسلام کے نام پر جو سیاست چلائی گئی اس میں پر جوش اسلام پسند قائدین فخر کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ ''پاکستان اسلام کے نام پر الاٹ ہو چکا ہے''۔ لیکن

اسلام کے نام پر کیا جانے والا یہ ہنگامہ جب اپنے آخری انجام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ پاکستان حقیقتہً خوش فہمی کے نام پر الاٹ ہوا تھا۔ اگر چہ نام نہاد اسلام پسند بطور خود یہ سمجھتے رہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر الاٹ ہوا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم تحریکیں اٹھیں ان سب میں یہ مشترک کمی تھی کہ ان کے رہنما یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ روح عصر کیا ہے اور تاریخ کی طاقتیں کدھر جارہی ہیں۔ اسی بے خبری کا یہ نتیجہ ہے کہ سو سال کی ہنگامہ خیز تحریکیں اور بے شمار جانی اور مالی قربانیوں کے باوجود ملت کے حصہ میں مزید تباہی کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

مانو سیوا سنگھ (کرنال) کے بانی اور ذمہ دار سوامی پریم مورتی بظاہر اپنے حلیہ کے اعتبار سے ایک غیر اہم انسان دکھائی دیتے ہیں مگر ان میں بیک وقت دو اعلیٰ صفتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے سینہ میں انسانیت کا درد رکھتے ہیں اور اسی کے ساتھ ان کو زندگی کا کافی تجربہ بھی ہے۔ انہوں نے بہت سی قیمتی باتیں بتائیں۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ ۱۰ سے ۱۲ سال کی عمر بچوں کے بننے کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر تک اگر ان سے کام نہ کرایا جائے تو پھر وہ ساری عمر کام نہ کر سکیں گے۔

یہ بلاشبہہ ایک درست بات ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ اپنی عادتوں کے پابند ہوتے ہیں۔ جس کے اندر جو سوچ بن گئی وہ دوبارہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچ نہیں پاتا، وہ اسی پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اسی طرح جو شخص جس چیز کا عادی ہو گیا وہ دوبارہ اپنی عادتوں کو بدل نہیں پاتا۔ استثنائی طور پر کوئی شخص ایسا ہوتا ہے جو اپنی سوچ یا اپنی عادت کو از سر نو تشکیل دے۔

کرنال سے ہم لوگ ۷ مئی ۲۰۰۰ کی شام کو واپس دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں ہمارا قافلہ کچھ دیر کے لئے پانی پت میں رکا۔ یہاں جو کچھ دیکھا اور جن سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں سے ایک مسٹر پی سی بجاج (Tel. 67838, 68982) تھے۔ وہ ۱۹۴۷ میں پاکستان سے انڈیا آئے اور پانی پت میں اپنا کاروبار قائم کیا۔ وہ پانی پت میں ہینڈلوم کا ایک بڑا کارخانہ چلاتے ہیں۔ ان کا شوروم اور ان کا آفس اتنا بڑا ہے کہ وہ خود ایک دنیا معلوم ہوتا ہے۔

مسٹر بجاج کو ان کے شاندار آفس میں دیکھ کر ایک عام آدمی سمجھے گا کہ وہ بہت خوش قسمت ہیں۔ مگر ان کی اس خوش قسمتی کا راز یہ نہیں ہے کہ وہ چاندی کا چمچہ اپنے منھ میں لے کر پیدا ہوئے یا ان کے نام کوئی بڑی لاٹری کھل گئی۔ ان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز پچاس سال کی مسلسل محنت ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۶ سال ہے مگر آج بھی وہ رات اور دن کے درمیان تقریباً ۱۸ گھنٹہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ ان سے کسی بھی وقت ملیں، وہ آپ کو ہر وقت خوش اور تروتازہ دکھائی دیں گے، وہ اپنی تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ سوشل کاموں کے لئے بھی پابندی کے ساتھ وقت نکالتے ہیں۔ ان کی زندگی اس حقیقت کا پیغام ہے کہ ـــــ محنت کرو اور بااصول زندگی گزارو، تم یقیناً کامیاب رہوگے۔

پانی پت اگر چہ کرنال کا ایک قصبہ ہے مگر وہ خود ایک شہر کے مانند ہے۔ مزید یہ کہ اس کی تاریخی حیثیت بہت زیادہ ہے۔ ۱۸۶۷ میں پانی پت میں میونسپلٹی کا قیام عمل میں آیا۔ پانی پت میں کئی اچھے تعلیمی ادارے ہیں۔ یہاں اون اور سوت کے بہت سے کارخانے ہیں جو پاور لوم سے چلتے ہیں، وغیرہ۔

پانی پت میں تین بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ تاریخ کی کتابوں میں پانی پت کی جنگیں (Battle of Panipat) ایک مستقل عنوان بن گیا۔ یہاں ہونے والی ۳ بڑی جنگوں کی تفصیل یہ ہے۔

پہلی جنگ وہ ہے جو ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ کو لڑی گئی۔ یہ جنگ مغل سردار بابر، کابل کا حکمراں، اور دہلی کے سلطان ابراہیم لودی کے درمیان ہوئی۔ اگر چہ ابراہیم لودی کی فوج کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر بابر کی انتہائی منظّم فوج کے مقابلہ میں اس کو شکست ہوئی۔ ابراہیم لودی خود بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ یہی جنگ برصغیر ہند میں مغل سلطنت کا آغاز بنی۔

دوسری جنگ ۵ نومبر ۱۵۵۶ کو ہوئی۔ یہ جنگ شہنشاہ اکبر کے اتالیق سردار بیرم خاں اور عادل شاہ سوری کے سپہ سالار ہیمو بقال کے درمیان لڑی گئی۔ ہیمو بقال کے پاس ایک لاکھ سپاہی تھے

اور مغل فوج کی تعداد ۲۰ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن بالآخر ہیموگرفتار ہوااور اس کی فوج تتر بتر ہوگئی۔

پانی پت کی تیسری جنگ جنوری ۱۷۶۱ میں لڑی گئی۔ یہ جنگ مراٹھا کمانڈر سداشیو بھاؤ اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان ہوئی مرہٹہ فوج کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی اور شاہ ابدالی کے پاس تقریباً چالیس ہزار سوار اور تقریباً ۴۰ ہزار پیادہ سپاہی تھے۔ آخر کار مرہٹوں کو مکمل شکست ہوئی۔

مرہٹوں کی شکست کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ اس کے سردار سداشیو بھاؤ نے غیر منصوبہ بند انداز میں فوج کی تعداد بہت بڑھالی جب کہ اتنی بڑی تعداد کے لئے کھانے پینے کا معقول انتظام موجود نہ تھا۔

اس معاملہ کا ایک سبق آموز پہلو یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی بظاہر کامیابی کا فائدہ تمام تر انگریزوں کو ملا۔ خود احمد شاہ ابدالی کو اپنے فوجیوں کے اصرار کی بنا پر ہندستان سے واپس جانا پڑا۔ دوسری طرف مرہٹوں کا زور ٹوٹ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کو کسی بڑی مزاحمت کے بغیر انڈیا میں اپنا قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد لمبی مدت تک اس علاقہ سے سیاسی استحکام ختم ہوگیا۔ اس سیاسی انارکی نے انگریزوں کے لئے کامیابی کا راستہ ہموار کر دیا:

This began 40 years of anarchy in north-west India and cleared the way for later British supremacy.

شری پیارے لال (کرنال) کا ایک پیپر یہاں کے سمّیلن میں پڑھا گیا۔ اس تقریر میں انہوں نے وحدت ادیان کے نظریہ کو پیش کیا تھا۔ میں نے تجربہ کیا ہے کہ جو لوگ وحدت ادیان کی بات کرتے ہیں وہ ہمیشہ بیانیہ انداز میں بولتے ہیں۔ کسی دلیل کے بغیر بیانیہ انداز میں اپنی بات کہتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی تقریر و تحریر میں نہ کوئی دلیل ہوتی ہے اور نہ کوئی علمی تجزیہ۔ مذکورہ پیپر کا بھی یہی حال تھا۔ کچھ اشعار اور کچھ تمثیلیں، بس اسی پر سارا مضمون تیار کیا گیا تھا۔

پیپر میں قرآن کی ایک آیت کا بھی حوالہ دیا گیا تھا۔ وہ آیت یہ ہے: **وکان اللہ بکل شیٔ محیطا** (النساء ۱۰۸) اس آیت سے انہوں نے ہمہ اوست (monism) کا نظریہ نکالا تھا، حالانکہ اس آیت کا سادہ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اس آیت میں اللہ کی

قدرت کا ہر چیز میں چھایا ہوا ہونا بتایا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر چیز اللہ کی ذات یا اس کے وجود کا حصہ ہے۔

یہ کوئی دلیل نہیں بلکہ محض لفظی تک بندی ہے۔ بدقسمتی سے اس قسم کی لفظی تک بندی ہر مذہبی گروہ اور ہر مذہبی فرقہ میں رائج ہے۔ خود مسلمانوں میں بھی اکثر فرقے اور گروہ اسی قسم کی کمزور دلیلوں پر کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ لفظی تک بندی کو عملی دلیل کا درجہ دئے ہوئے ہیں۔

موجودہ زمانہ سائنسی استدلال کا زمانہ ہے۔ آج مبنی بر عقل دلیل (reason-based argument) کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر میرے علم کے مطابق، کسی بھی مذہبی گروہ میں اس قسم کا استدلالی طریقہ موجود نہیں۔ اسلام مکمل طور پر ایک علمی و عقلی مذہب ہے مگر موجودہ زمانہ میں مجھے کوئی بھی مسلم مقرر یا محرر دکھائی نہیں دیتا جس نے حقیقی معنوں میں سائنسی استدلال کے اصول پر اپنے فکر کو پیش کیا ہو۔

ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میری زبان سے نکلا۔ جنت کی قیمت عمل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عمل کی کوئی بھی مقدار جنت کی قیمت نہیں بن سکتی۔ جنت کا استحقاق صرف ایک چیز ہے، اور وہ سوال (دعا) ہے۔ جنت صرف ان انسانوں کے لئے ہے جو حقیقی طور پر یہ کہہ سکیں: **اللھم انا نسألک الجنة و نعوذ بک من النار**۔ عمل بھی اسی لئے ہے کہ آدمی کو حقیقی معنوں میں سائل بنا سکے۔ عجل آدمی کے اندر اس پیغمبرانہ سوال کی اسپرٹ جگائے وہی عمل ہے اور جو عمل یہ اسپرٹ نہ جگائے وہ عمل بھی حقیقی عمل نہیں۔

سوال کیا ہے۔ سوال دراصل رب العالمین کی کامل قدرت کے مقابلہ میں اپنے کامل عجز کا اعتراف کرنا ہے۔ سچا سوال ہمیشہ احساس عجز سے ابھرتا ہے نہ کہ احساس عمل سے۔

ایک مجلس میں مجھ سے کہا گیا کہ قرآن کی کوئی آیت ہم کو بتایئے جس میں ہمارے لئے کوئی نصیحت ہو۔ میں نے یہ آیت پڑھی: **لاتؤتوا السفهاء أموالكم** (النساء ۵) یعنی تم نادانوں کو اپنے مال نہ دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مال کو ٹھیک طور پر سنبھالنے کے لئے عقل اور شعور کی ضرورت

ہے۔اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں کو مالدار بنانے سے پہلے انہیں باشعور بناؤ۔

میں نے کہا کہ اس کی ایک قریبی مثال پنجاب ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد پنجاب میں لوگوں کے پاس کثرت سے مال آ گیا۔مگر تعلیم میں کمی کی بنا پر وہ زیادہ باشعور نہ تھے چنانچہ کچھ نادان لیڈروں کے بہکاوے کے نتیجہ میں وہاں متشددانہ انداز میں علیحدگی کی تحریک چل پڑی۔اس کے انتہائی غیر حقیقت پسندانہ سیاست کا نتیجہ صرف جان و مال کی تباہی کی صورت میں برآمد ہوا۔

میں نے کہا کہ پنجاب میں جو لوگ اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے تھے۔وہ اس تحریک کی غلطی کو اچھی طرح سمجھتے تھے،مثال کے طور پر ڈاکٹر مہندر سنگھ۔اگر پنجاب میں ڈاکٹر مہندر سنگھ جیسے تعلیم یافتہ لوگ ہوتے تو کبھی اس قسم کی جذباتی تحریک وہاں نہ پھیلتی۔مگر پنجاب میں جس نسبت سے مال آیا اسی نسبت سے وہاں تعلیم نہ آسکی۔اس غیر متناسب ترقی نے وہاں علیٰحدگی پسندی کو فروغ دیا۔اس تباہ کن تحریک کو کچلنے میں صرف نئی دہلی کا جو خرچ ہوا اس کی مقدار ایک سو کرور روپیہ تھی۔دوسرے نقصانات اس کے علاوہ ہیں۔

پانی پت میں ایک تعلیم یافتہ ہندو نوجوان مسٹر چودھری سے ملاقات ہوئی۔واپسی میں وہ گاڑی میں ہمارے ساتھ دہلی تک آئے۔ان کا خاندان ۱۹۴۷ میں پاکستان سے یہاں آ گیا تھا۔پاکستان میں یہ لوگ جس بستی میں رہتے تھے وہاں کے مسلمانوں سے اب بھی ان کے اچھے تعلقات ہیں اور وہ جب بھی ہندستان آتے ہیں تو ان سے ضرور ملتے ہیں۔انہوں نے بتایا کہ حال میں ان کا ایک مسلمان دوست پاکستان سے آیا اور پانی پت میں کچھ وقت ان کے ساتھ رہا۔اس مسلمان نے ایک روز بے تکلفی کے انداز میں کہا کہ ''یار، ہمارے اور تمہارے درمیان کیا فرق ہے۔سارا جھگڑا صرف نام ہی کا تو ہے اپنا نام بدل لو اور پاکستان آ جاؤ''۔

میں نے سوچا کہ دو قومی تحریک کا یہ یک قومی انجام کیسا عجیب ہے۔۷ مئی ۲۰۰۰ کی رات کو ہم لوگ دہلی واپس پہنچے۔

ہندستان کے مسلم رہنماؤں اور جماعتوں کے قائدین سے سوالات

سوال نامہ برائے اردو نیوز (جدّہ)

(۱) آزادی کے ۵۳ سال گزر جانے کے بعد بھی مسلمانانِ ہند یکسو نہیں ہیں، انہیں ہمیشہ مسائل درپیش رہے ہیں، آج بھی وہ مختلف النوع مسائل ومشکلات سے دوچار ہیں، آپ کے نزدیک اس کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟

(۲) اتحادِ ملت کے لئے وقتاً فوقتاً کوششیں کی جاتی ہیں مگر خاطر خواہ نتائج برآمد کیوں نہیں ہوتے، آپ کے خیال میں اتحادِ ملت کی راہ میں بنیادی رکاوٹیں کیا ہیں؟

(۳) ملت کے مشترک مسائل پر غور وخوض کر کے ان کے حل ڈھونڈنے کے لئے کیا مسلم مجلس مشاورت اور ملی کونسل کافی ہیں یا کوئی نیا پلیٹ فارم وجود میں آنا چاہئے؟

(۴) ہندستانی مسلمانوں کو یوں تو فسادات اور تعلیم ورزگار کے میدانوں میں پسماندگی جیسے مسائل ہمیشہ درپیش رہے اور آج بھی بڑی حد تک درپیش ہیں، لیکن ہمارا احساس ہے کہ فی زمانہ سب سے بڑا اور اہم مسئلہ ہندستانی مسلمانوں کی دینی شناخت کا ہے۔ اگر آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں تو اس مسئلہ کا کیا حل ہے؟

(۵) آپ (کی جماعت یا تنظیم) کے پاس ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور اس کی تعمیر وترقی کے لئے کیا منصوبہ ہے؟

(۶) تعلیم اور روزگار کے میدان میں کی جانے والی کوششوں کو آپ کافی سمجھتے ہیں یا کچھ مزید چاہتے ہیں؟

(۷) عالم اسلام کی موجودہ صورت حال کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں؟

(۸) مسئلہ فلسطین کے حل بالخصوص یروشلم اور مسجد اقصیٰ کی بازیابی کے لئے آپ کے خیال میں کیا کیا جانا چاہئے؟

(۹) حکومت ہند اور اسرائیل کے بڑھتے ہوئے تعلقات کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

(۱۰) سنا ہے نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ میں ایف بی آئی (فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن) نے اپنا دفتر کھول لیا ہے جس کا واحد مقصد 'اسلامی دہشت گردی' کی روک تھام بتایا گیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

(۱۱) کیا آپ چاہیں گے کہ مسلم ممالک اور ہندستانی مسلمانوں کے درمیان باقاعدہ رابطہ کی کوئی شکل پیدا کی جائے اور اس چیز کو ہندستان مسلم ملکوں کے درمیان قریبی تعلقات قائم کرنے کے لئے استعمال کیا جائے؟

اردو نیوز (جدہ) کے سوال نامہ کا جواب

۱ مسائل استثنائی طور پر مسلمانانِ ہند کی زندگی کا حصہ نہیں ہیں بلکہ وہ انسانی زندگی کا عمومی حصہ ہیں۔ ان کا سامنا معتدل انداز میں کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کو غیر ضروری طور پر یہ یقین دلایا جائے کہ تم اپنے ملک میں مسائل کا شکار ہو رہے ہو۔ بدقسمتی سے زبان وقلم کے حاملین نے مسلمانوں کو اسی فرضی اندیشہ میں مبتلا کیا۔ اس بنا پر ہندستانی مسلمانوں کا ردّعمل اس ملک میں غیر معتدل ہوگیا۔ کامیابی کا راز حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا ہے۔ مگر مذکورہ غلط سوچ کی بنا پر مسلمان ماضی میں ایسا نہ کر سکے۔ حالانکہ یہی ہندستانی مسلمان جب باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں تو وہاں وہ مکمل طور پر مقامی حالات کی رعایت کرتے ہوئے عمل کرتے ہیں، اور کامیاب رہتے ہیں۔ ہندستان میں بھی انہیں یہی حقیقت پسندانہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

۲ اتحادِ ملت کی رکاوٹ اتحاد کا غلط فارمولا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اختلاف کو ختم کرو تا کہ اتحاد قائم ہو۔ مگر یہ ایک غیر فطری بات ہے۔ اتحاد کا صحیح فارمولا یہ ہے کہ ـــــ اختلاف کو برداشت کرو تا کہ اتحاد قائم ہو۔ اختلاف کے باوجود متحد ہونے سے اتحاد قائم ہوتا ہے نہ کہ اختلاف کو مٹانے سے۔ کیوں کہ اختلاف کو مٹانا تو عملاً ممکن ہی نہیں۔ مزید یہ کہ اختلاف کوئی برائی (evil) نہیں۔ بلکہ وہ عین رحمت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف ذہنی ارتقاء کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر اختلاف رائے نہ ہو تو ذہنی ارتقاء کا عمل رک جائے گا۔ ایسی حالت میں اصل کام یہ ہے کہ اختلاف اور تنقید کے معاملہ میں لوگوں کی غیر ضروری حسّاسیت کو ختم کیا جائے نہ کہ لاحاصل طور پر خود اختلاف کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔

۳ مسلم مجلس مشاورت اور ملی کونسل، موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی دوسری تحریکوں کی طرح، صرف ردّعمل کی تحریکیں ہے، وہ کسی مثبت فکر یا ایجابی نظریہ کے تحت وجود میں نہیں آئیں۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ یہاں صرف وہ تحریک کامیاب ہوتی ہے جو حالات کے مثبت

جواب (positive response) کے طور پر وجود میں آئے ، نہ کہ حالات کے منفی جواب (negative response) کے طور پر۔ اور یہ تحریکیں یقینی طور پر اس معیار پر پوری نہیں اترتیں۔

۴ فساد، تعلیم، بے روزگاری اور دینی شناخت کے مسائل حقیقی سے زیادہ فرضی ہیں۔ فسادات کا مسئلہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کے بے برداشت مزاج کی وجہ سے ایک سنگین مسئلہ بن گیا۔ اسی طرح تعلیمی پس ماندگی کا مسئلہ اس لئے پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو تعلیم کے بجائے غیر ضروری سیاسی مسائل میں الجھا دیا گیا۔ بے روزگاری کے مسئلہ کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کو محنت کا سبق دینے کے بجائے بے نتیجہ طور پر رزرویشن کا سبق دیا گیا۔ اسی طرح دینی شناخت کے مسئلہ کی حیثیت بھی ایک فرضی خطرہ کی ہے۔ ہندستان میں اس وقت جتنا زیادہ دینی کام ہو رہا ہے وہ کسی بھی دوسرے ملک میں نہیں ہو رہا ہے، حتی کہ مسلم ملکوں میں بھی نہیں۔ مذہبی آزادی دور جدید کا ایک مسلمہ اصول ہے، ایسی حالت میں مسلمانوں کی مذہبی شناخت کے لئے کسی خارجی خطرہ کا کوئی امکان ہی نہیں۔

۵ ہم اپنا کام اسلامی سنٹر اور الرسالہ مشن کے تحت کر رہے ہیں۔ ہماری تشخیص کے مطابق تمام مسائل کی جڑ صحیح طرز فکر کا فقدان ہے، اس لئے ہم اپنی تمام کوشش مسلمانوں کے اندر فکری بیداری اور شعوری تعمیر پر لگائے ہوئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ مسلمانوں کا تعلق غیر مسلموں سے داعی اور مدعو کا تعلق ہے نہ کہ حریف اور رقیب کا۔ موجودہ زمانہ میں ''غلط رہنمائی کے نتیجہ میں'' مسلمانوں کا تعلق غیر مسلموں سے رقابت کی بنیاد پر قائم ہو گیا جو دعوتی عمل میں ایک سنگین رکاوٹ ہے۔ ہم مسلمانوں کے اندر دوبارہ دعوتی شعور کو زندہ کر رہے ہیں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معتدل فضا قائم ہو تا کہ دعوتی عمل دوبارہ موثر انداز میں جاری ہو سکے۔

۶ تعلیم اور روزگار کے میدان میں اب ہندستانی مسلمانوں کے اندر ایک نمایاں تغیر (sea change) آچکا ہے۔ آج کا ہندستانی مسلمان ان دونوں میدانوں میں اتنی تیزی سے آگے

بڑھ رہا ہے کہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندستانی مسلمان تمام مسلم ملکوں سے آگے بڑھ جائیں گے ـــــ جہاں تک عالم اسلام کی موجودہ صورت حال کا تعلق ہے، وہ بظاہر کوئی روشن تصویر پیش نہیں کرتے۔ اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مسلم دنیا کے مسلمانوں میں پرشور تحریکوں کے باوجود، ابھی تک اس چیز کا فقدان ہے جس کو سمت کا شعور (sense of direction) کہا جا سکتا ہے۔

۷ فلسطین کے مسئلہ کی جڑ یہ ہے کہ ۱۹۴۸ سے لے کر اب تک اس معاملہ میں جو کچھ کیا گیا وہ سب جذباتی ردعمل کے تحت کیا گیا نہ کہ کسی سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت۔ اس مسئلہ کے حل کا آغاز یہ ہے کہ اس غلطی کی اصلاح کی جائے۔ اس اصلاح کی پہلی علامت یہ ہوگی کہ اس موضوع پر جذباتی تقریر اور متشددانہ طریقہ کو مکمل طور پر ترک کر دیا جائے اور کامل یکسوئی کے ساتھ پرامن طریقہ کار کو اختیار کیا جائے۔

۸ حکومت ہند اور اسرائیل کے تعلقات کی نوعیت میرے نزدیک کوئی غیر معمولی چیز نہیں۔ یہ قومی انٹرسٹ کا معاملہ ہے جو ہر ایک کے ہاں پایا جاتا ہے۔ امریکہ کھلے طور پر اسرائیل نواز ہے۔ اس کے باوجود اکثر عرب ممالک اس سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ نیز تقریباً ۸ ملین مسلمان اسی اسرائیل نواز امریکہ میں آباد ہو کر اس کی قومی مشین کا پرزہ بنے ہوئے ہیں۔ پھر ایک کے بارے میں احتجاج اور دوسرے کے بارے میں خاموشی کا کیا جواز۔

۹ ''اسلامی جہاد'' کے نام پر جب امریکہ کے مفادات کو تشدد کا نشانہ بنایا جائے تو ہر ملک اسی طرح اپنے تحفظ کی تدبیر کرے گا، خواہ وہ امریکہ ہو یا کوئی دوسرا مسلم یا غیر مسلم ملک۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ ان لوگوں کو نصیحت کی جائے جو اسلام کے نام سے غلط طور پر تشدد کا کلچر چلا رہے ہیں نہ کہ امریکہ کو۔

۱۰ ہندستانی مسلمان اور مسلم ممالک کے درمیان مذہبی روابط ہمیشہ سے موجود ہیں اور آئندہ بھی باقی رہیں گے۔ مگر ایسا تعلق جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر سیاسی نوعیت رکھتا ہو، وہ نہ پہلے مفید تھا اور نہ آئندہ مفید ہو سکتا ہے۔ (۱۲/اگست، ۲۰۰۰)

ایک خط

برادر محترم عبدالسلام اکبانی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۲۵ اگست کو آپ سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آپ نے گفتگو کے دوران زاویۂ نظر (attitude of mind) کا تذکرہ کیا تھا۔ جس کا ذکر الرسالہ ماہ ستمبر ۲۰۰۰ (صفحہ ۶۱) میں آیا ہے۔ زاویہ نظر کا معاملہ ہر شخص اور ہر قوم کی زندگی میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ زاویہ نظر کی درستگی اور نادرستگی پر تمام دوسری انفرادی اور قومی سعادتوں کا دارومدار ہے۔

زاویہ نظر کیا ہے۔ اس کی ایک سادہ مثال ٹائمس آف انڈیا (۲۳ اگست ۲۰۰۰) میں نظر سے گزری۔ جاپان کے موجودہ وزیر اعظم یوشیرو موری (Yoshiro Mori) حال میں ہندستان کے دورے پر آئے تھے۔ وہ سب سے پہلے بنگلور گئے۔ وہاں مشہور سافٹ ویر کمپنی انفوسیز (Infosys) نے ان کا استقبالیہ (reception) دیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انفوسیز سافٹ ویر کمپنی کے چیرمین نرائن مورتی (N. R. Narayana Murthy) نے کہا کہ جاپان ایشیا کا ہیرا ہے:

Japan is the jewel of Asia.

اس کے جواب میں جاپانی وزیر اعظم نے ہندستانی ماہرین کو جاپان آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ جاپان میں ایک کہاوت ہے کہ اگر ہیرے کی پالش نہ کی جائے تو اس میں چمک نہیں آئے گی۔ ہیرے کے لئے ضروری ہے کہ اس پر پالش کی جائے:

In Japan, there is a saying that if the jewel is not polished, it will not shine. It is necessary for the jewel to be polished.

اس مثال میں دیکھئے۔ جاپانی وزیر اعظم اگر اپنے اندر فخر پسندی کا مزاج لئے ہوئے ہوتے تو وہ مسٹر نرائن مورتی کے جواب میں پر فخر انداز میں کہتے کہ آپ کے اس اعتراف کا شکریہ۔ مگر جاپان کا قومی مزاج تواضع پسندی کا مزاج ہے۔ اسی مزاج کی بنا پر جاپانی وزیر اعظم کی زبان سے

فخریہ الفاظ کے بجائے منکسرانہ الفاظ نکلے۔

زاویہ نظر (attitude of mind) کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے سائنٹفک طرز خیال (scientific attitude)، اور دوسرا ہے متعصّبانہ طرز خیال (biased attitude)۔ سائنٹفک طرز خیال یہ ہے کہ آدمی کے ذہن پر کسی غیر متعلق چیز کا غلبہ نہ ہو، وہ خالص حقائق کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرے۔ وہ اپنی ذات کو الگ کر کے بے لاگ طور پر حقیقتوں کو دیکھ سکے۔ اس کے برعکس متعصّبانہ طرز فکر یہ ہے کہ آدمی کا ذہن ایک متاثر ذہن ہو۔ وہ اس ذہنی کمزوری میں مبتلا ہو جائے جس کو پیشگی طور پر اچھا یا برا خیال رکھنا (preoccupation) کہا جاتا ہے۔ اس فرق کو دوسرے لفظوں میں حقیقت پسندانہ طرز فکر (realistic approach) اور غیر حقیقت پسندانہ طرز فکر (un-realistic approach) کہہ سکتے ہیں۔

عربی کا ایک مقولہ ہے کہ کسی چیز کی محبت تم کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے (**حبک الشئ یعمی و یصم**)۔ یہی بات برعکس طور پر بھی درست ہے۔ یعنی کسی چیز سے بغض آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے (**بغضک الشئ یعمی و یصم**)۔

میں سمجھتا ہوں کہ دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا معاملہ، دونوں ہی معاملہ میں آدمی کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے اندر صحیح طرز فکر پایا جائے۔ غلط طرز فکر اگر جزئی طور پر ہو تب بھی وہ آدمی کے لئے ہلاکت کا سبب بن جائے گا۔

طرز فکر کا نادرست ہونا کوئی سادہ بات نہیں، وہ نہایت سنگین بات ہے۔ جو لوگ اس کمزوری میں مبتلا ہوں، ان کا نقطہ نظر اور طریق عمل دونوں غلط ہو کر رہ جائیں گے، ایسے لوگ، حدیث کے الفاظ میں، پہلے قول زور کا شکار ہوں گے اور اس کے بعد عمل زور کا شکار۔ مزید یہ کہ حقائق کی اس دنیا میں چونکہ غیر حقیقی نقطہ نظر قابل عمل نہیں، اس لئے حالات کے دباؤ کے تحت آخر کار وہ دہرا معیار (ڈبل اسٹینڈرڈ) کا شکار ہو جائیں گے جس کا دوسرا نام منافقت ہے۔ یہاں میں اس معاملہ کی کچھ مثالیں نقل کروں گا۔

۱۔ دہلی میں ایک بدنام ہندی اخبار ہے۔ وہ ہر ایک کے بارے میں الٹی باتیں چھاپتا رہتا ہے۔ اس نے ہندستان کی ایک اسلامی جماعت کے بارے میں چھاپا کہ وہ پاکستان کی ایجنٹ ہے۔ جماعت کے لوگوں نے جب اس کو پڑھا تو ایسا نہیں ہوا کہ وہ اس کو صحیح مان کر اس کی عمومی تشہیر کرنے لگیں۔ بلکہ اس کو دیکھتے ہی انہوں نے کہہ دیا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس کے برعکس اسی اخبار میں میرے بارے میں ایک بے ہودہ رپورٹ چھپی تو اس جماعت کے لوگوں نے فوراً اس کو صحیح مان کر اس کو ہر طرف پھیلانا شروع کر دیا۔

اس دہرا روش کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ یہ لوگ متعصّبانہ طرز فکر میں جی رہے تھے۔ اپنے بارے میں متعصّبانہ محبت اور دوسرے کے بارے میں متعصّبانہ بغض۔ اس کا نقصان انہیں یہ اٹھانا پڑا کہ وہ دہرا طرز فکر کی برائی میں مبتلا ہو گئے۔ اپنے معاملہ میں ان کے سوچنے کا طریقہ کچھ تھا اور دوسرے کے معاملہ میں ان کے سوچنے کا طریقہ کچھ اور۔

۲۔ اس معاملہ کی دوسری مثال یہ ہے کہ پچھلے تقریباً دو سو سال کے درمیان ہر ملک کے مسلم رہنماؤں کی سوچ کم و بیش ایک ہی چیز کا غلبہ رہا ہے، اور وہ مغربی استعمار (colonialism) کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو اتنا زیادہ بڑھایا گیا کہ موجودہ زمانہ میں پیدا ہونے والا تمام مسلم لٹریچر مغرب کی نفرت سے بھر گیا۔ مغربی قومیں اسلام دشمن ہیں، مغربی قومیں اسلام کے خلاف سازش کر رہی ہیں۔ یہ تصور دور جدید کی پوری مسلم نسل پر چھا گیا۔

یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان جن مسائل کا شکار ہوئے ان کا سبب تمام تر خود مسلمانوں کا داخلی زوال تھا۔ مگر مذکورہ منفی ذہن کی بنا پر دنیا بھر کے مسلم مقررین اور محررین نے یہ کیا کہ مسلمانوں کے تمام مسائل و مصائب کو مغربی استعمار کے خانہ میں ڈال دیا۔ یہ منفی ذہن اتنا زیادہ بڑھا کہ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ مغربی قوموں سے مسلمانوں کا رشتہ عداوت اور مقاطعہ کا ہونا چاہئے نہ کہ محبت اور تعلق کا۔

۳۔ ایک اور پہلو سے دیکھئے تو یہ سارا معاملہ زاویۂ نظر (angle of vision) کا نظر آتا ہے۔

کسی چیز کو دیکھنے کے کئی رخ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ ایک چیز کو اس کے صحیح رخ سے دیکھیں تو اس کے بارے میں آپ کی جو رائے بنے گی وہ درست رائے ہوگی۔ اس کے برعکس اگر اس چیز کو غلط رخ سے دیکھا جائے تو آپ کی رائے اس کے بارے میں بالکل غلط ہو جائے گی۔

اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک کتاب چھپی تھی جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ برٹش ایمپائر نے ہندستان میں جو ریلوے لائن بچھائی ہے وہ ریلوے لائن نہیں ہے بلکہ وہ لوہے کی زنجیریں ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ ان میں ہندستان کو ہمیشہ کے لئے جکڑ دیا جائے۔ زاویۂ نظر کے فرق کی بنا پر رائے کے مختلف ہونے کی یہ بڑی عجیب مثال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں جو ریلوے لائن بچھائی گئی وہ ملک کے لئے ایک عظیم نعمت تھی۔ اس نے ہمارے ملک میں پہلی بار سواری اور بار برداری کو انتہائی آسان بنا دیا۔ حتی کہ یہی ریلوے لائنیں تھیں جس کے اوپر نہرو اور دوسرے لیڈروں نے سوار ہو کر آزادی کی تحریک سارے ملک میں پھیلا دی۔ اب اگر جواہر لال نہرو اس زاویہ نظر سے ریلوے لائن کو دیکھتے تو وہ اس کو ملک کے حق میں ایک نعمت بتاتے مگر انہوں نے ریلوے لائن کو بالکل مختلف زاویۂ نظر سے دیکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قیمتی ریلوے لائن ان کو غلامی کی آہنی زنجیر دکھائی دینے لگی۔

اس غیر حقیقت پسندانہ طرز فکر کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ پوری مسلم نسل دہرا معیار (ڈبل اسٹینڈرڈ) کا شکار ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک طرف اپنے سابقہ فکری تسلط (obsession) کی بنا پر اپنی تقریر اور تحریر میں برطانیہ اور امریکہ کو ہمیشہ برا کہتے ہیں۔ حتی کہ اگر کوئی ایسا نہ کہے تو فوراً اس کو اسلام دشمنوں کا ایجنٹ قرار دے دیتے ہیں۔ مگر انہی مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ پہلا موقع ملتے ہی وہ اپنی اولاد کو اور اپنے رشتہ دار کو برطانیہ اور امریکہ بھیج دیتے ہیں تا کہ وہ ان ''اسلام دشمن'' طاقتوں کی مشین کے پرزے بن سکیں، صرف اس قیمت پر کہ وہاں ان کو مادی اعتبار سے زیادہ بہتر زندگی حاصل ہو جائے گی۔

دہلی، ۲۶ اگست ۲۰۰۰ — دعا گو وحید الدین

۱۔ ناگپور کے قارئین الرسالہ نے وہاں اپنا ایک حلقہ بنایا ہے۔ اس کا نام انہوں نے پازیٹیو تھنکرس فورم (Positive Thinkers' Forum) رکھا ہے۔ قارئین الرسالہ کے حلقہ کے لئے یہ موزوں ترین نام ہے۔ جس زمانہ میں اشتراکیت کا زور تھا، اس سے متاثر ادیبوں نے ہر جگہ ایسے حلقے بنائے تھے جن کا نام ترقی پسند ادیب (Progressive writers) ہوتا تھا۔ اس نام میں کوئی معنویت نہ تھی۔ حلقہ الرسالہ کے لئے پازیٹیو تھنکرس فورم کا نام بہت بامعنیٰ ہے۔ دوسروں کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔ اور ہر مقام پر پازیٹیو تھنکرس فورم کے نام سے حلقہ بنا کر کام کرنا چاہئے۔ اس نام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے بخوبی طور پر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس فورم کا بنیادی ذہن کیا ہے اور وہ کس قسم کا فکری انقلاب لانا چاہتا ہے۔

۲ اٹلی کی ایک تنظیم اسوسی یشن کلچرل آرمونیا (Associatione Culturale Armonia) کے پریزیڈنٹ اٹومبری ماریو (Attombbri Mario) کی قیادت میں نصف درجن اطالوی افراد کا ایک وفد ۱۱ اگست ۲۰۰۰ کو اسلامی مرکز میں آیا۔ اور صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ گفتگو کا موضوع خاص طور پر روحانیت (spirituality) تھا۔ ان لوگوں کو تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ اسلام میں روحانیت کا تصور کیا ہے۔ انہوں نے صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی کہ وہ اٹلی میں روحانیت کے موضوع پر ہونے والے سیمنار میں ضرور شرکت کریں۔

۳ بی بی سی لندن کے لئے مسٹر شکیل اختر نے ۱۷ اگست ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ زمانہ میں بظاہر مسلمانوں کے لئے جو مخالف حالات پیدا ہوئے ہیں ان کا ایک عظیم مثبت پہلو ہے۔ اصل یہ ہے کہ لمبی مدت سے مسلمانوں کے رہنما ان کو فخر کی غذائیں دے رہے تھے۔ وہ انہیں جذباتیت میں مبتلا کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ مسلمان پدرم سلطان بود کی نفسیات میں جینے لگے تھے۔ یہ نفسیات کسی قوم کی ترقی میں مستقل رکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسلم

مقررین اور محررین نے اس نفسیات کو اتنا زیادہ گہرا بنا دیا تھا کے صرف سمجھانے بجھانے سے یہ ختم ہونے والی نہیں تھی۔ موجودہ حالات گویا مسلمانوں کے معلم بن کر ظاہر ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب مسلمان تیزی سے حقیقت پسند بنتے جا رہے ہیں۔ یہ انٹرویو ۲۶ اگست ۲۰۰۰ کو بی بی سی لندن کے شام کے پروگرام میں نشر کیا گیا۔

۴ بی بی سی لندن کے ایک پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے ان کے ایک پینل ڈسکشن میں حصہ لیا۔ اس میں تین آدمی شریک تھے ـــــ وشنو ہری ڈالمیا، پروفیسر تھمپو، صدر اسلامی مرکز۔ اس کا نظم براہ راست لندن سے کیا گیا تھا۔ یہ پروگرام ۱۸ اگست ۲۰۰۰ کی شام کو ہوا۔ پروگرام کے کنڈکٹر مسٹر ٹریوک بارنیز (Trevok Barnes) لندن سے ہر ایک کا نام لے کر سوال کرتے تھے۔ اور نئی دہلی میں بیٹھے ہوئے تینوں آدمی باری باری اس کا جواب دیتے تھے۔ یہ پروگرام انگریزی میں تھا اور اس کا عنوان یہ تھا:

Increasing intolerance in present Indian society.

ایک سوال کے جواب میں صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ موجودہ انٹالرنس کا سبب مذہبی قدروں کا انحطاط ہے۔ اس لئے مذہبی قدروں کا احیاء کر کے اس مسئلہ کا حل کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہندستان میں ہونے والے تشدد کے واقعات کا کشمیر کی متشددانہ تحریک سے کوئی تعلق نہیں۔ دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

۵ کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) میں تاریخ کے پروفیسر این سلی ایمبری (Ainslie T. Embree) نے ۲۸ اگست ۲۰۰۰ کو دہلی میں صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ وہ مذہب اور امن کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ ان کے سوالات کا تعلق اس سے تھا کہ اسلام میں جنگ اور امن کے بارے میں کیا تعلقات ہیں۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام مکمل طور پر امن اور انسانیت کا مذہب ہے۔ وہ پر امن طریقہ کار کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے۔ گوریلا وار اور پر اکسی وار اسلام میں جائز نہیں۔ ملک اور قوم اور مال کی جنگ کو خواہ اسلام کے نام پر لڑا

جائے پھر بھی وہ اسلامی جنگ نہیں ہوگی۔ یہ انٹرویو تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہا۔

۶ ہفت روزہ نئی دنیا (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر جمشید عادل نے ۲۸ اگست ۲۰۰۰ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق بھارتیہ جنتا پارٹی کے ناگپور اعلان (۲۸ اگست ۲۰۰۰) سے تھا جس میں انہوں نے مسلمانوں کے لئے نہایت نرم انداز اختیار کیا ہے۔ جواب میں کہا گیا کہ یہ تو عین ہمارے اندازے کے مطابق ہے۔ ہم پچھلے ۲۵ سال سے یہ کہتے آئے ہیں کہ آر ایس ایس یا بھارتیہ جنتا پارٹی مسلمانوں کے لئے حقیقی خطرہ نہیں۔ کیوں کہ اس دنیا کے معاملات کا فیصلہ فطرت کے قوانین اور تاریخی عوامل کرتے ہیں نہ کہ کوئی فرد یا جماعت۔

۷ زی ٹی وی کی ٹیم نے ۲۸ اگست ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق بھارتیہ جنتا پارٹی کے ناگپور اجلاس (۲۷۔۲۸ اگست) سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور آر ایس ایس سے مسلمانوں کی دوری کی وجہ کچھ تاریخی شبہات ہیں۔ جب تک ان شبہات کو دور نہ کیا جائے مسلمان کبھی بھی بڑی تعداد میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو ووٹ نہیں دیں گے۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو اگر مسلمانوں کا ووٹ لینا ہے تو ان کو کھلے طور پر یہ اعلان کرنا ہوگا کہ وہ جس راستہ پر چل رہے تھے وہ درست نہ تھا۔ یہ کہنا کہ کانگریس نے بھاجپا کے اندر غلط فہمی پھیلائی مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے بجائے انہیں خود اپنی غلطی کا اعتراف کرنا چاہئے۔

۸ گاندھی سمیتی اینڈ درشن سمیتی کی سالانہ میٹنگ ۲۹ اگست ۲۰۰۰ کو سائوتھ بلاک (نئی دہلی) میں وزیر اعظم ہند کی صدارت میں ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس موقع پر انہوں نے کہا کہ اس وقت ملک کا سب سے بڑا مسئلہ اخلاقی زوال کا مسئلہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اخلاقی اور انسانی قدروں کو زندہ کرنے کے لئے ملک گیر پیمانہ پر ایک مہم چلائی جائے۔

۹ نئی دہلی کے جیز زاینڈ میری کالج میں ۳۰ اگست ۲۰۰۰ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں کالج کی طالبات اور اساتذہ اکٹھا ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے اس موقع پر پازیٹیو وے آف لائف کے موضوع پر تقریر کی۔ تقریر کے بعد بڑی تعداد میں سوالات کئے گئے جن کا جواب دیا گیا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی بتایا گیا کہ پازیٹیو وے آف لائف کے سلسلہ میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے۔

۱۰ دوردرشن کے پروگرام ''روزانہ'' کے تحت ان کی ٹیم نے ۳۱ اگست ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بھارتیہ جنتا پارٹی کے ناگپور اعلان (۲۷۔۲۸ اگست ۲۰۰۰) سے تھا۔ جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو یہ جاننا چاہئے کہ مسلمانوں کے درمیان اس کی امیج منفی بن گئی ہے۔ جب تک کسی قابل لحاظ اقدام کے ذریعہ اس منفی امیج کو دور نہ کیا جائے مسلمان بھارتیہ جنتا پارٹی کو سپورٹ دینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

۱۱ روزنامہ راشٹر سہارا ہندی (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر سرویش نے ۳ ستمبر ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر نیویارک میں ہونے والی آل مذاہب کانفرنس (۲۸۔۳۰ اگست ۲۰۰۰) سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ دنیا سے تشدد کو ختم کرنے کے لئے اس قسم کی آل مذاہب کانفرنس مفید نہیں۔ دنیا میں مذہب کے نام پر جو تشدد ہو رہا ہے اس کا سبب عوام کی تعلیمی پس ماندگی ہے۔ اسی بنا پر سطحی لیڈروں کو یہ موقع ملتا ہے کہ عوام کے جذبات کو مذہب کے نام پر بھڑکا کر تشدد برپا کریں۔ اس مسئلہ کو ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنایا جائے۔

۱۲ ہندی روزنامہ دینک جاگرن (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر الوک کمار نے ۳ ستمبر ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بھارتیہ جنتا پارٹی کے ناگپور رزولیوشن (۲۸ اگست ۲۰۰۰) سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق

ہے مجھے کسی پارٹی سے کوئی نفرت نہیں۔ میں ہر پارٹی کو انسانیت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ مگر اس رزولیوشن کے ذریعہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اس میں شامل ہوں اور اس کو ووٹ دیں۔ مگر مسلم عوام کی نظر میں بھاجپا کی تصویر پر ہندو اور اینٹی مسلم تصویر ہے۔ بھاجپا کو اپنی یہ تصویر درست کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی مسلمان اس کو ووٹ دے سکتے ہیں۔

۱۳ سہارا ٹی وی (نئی دہلی) کے اسٹوڈیو میں ۴ ستمبر ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ انٹرویور مسٹر ونود دوا تھے۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بھارتیہ جنتا پارٹی کے ناگپور اعلان اگست ۲۰۰۰ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو ہمارا میسج یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو جانے کہ پولیٹکس گیو اینڈ ٹیک (give and take) کا نام ہے۔ اگر وہ مسلمانوں کا ووٹ چاہتے ہیں تو انہیں بھی مسلمانوں کو کوئی قابل لحاظ چیز دینا ہوگا۔ مثلاً وہ یہ اعلان کریں کہ عبادت گاہ ایکٹ (Places of Worsihip Act) کے مطابق ہر مسجد کو ۱۹۴۷ کی حیثیت پر باقی رکھا جائے گا اور جہاں تک بابری مسجد کا سوال ہے اس کے معاملہ میں عدالت کے فیصلہ کو من وعن تسلیم کیا جائے گا۔ اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہم یہ کہیں گے کہ پالیٹکس میں کوئی لگی بندھی پالیسی نہیں ہوتی بلکہ جو چیز لگی بندھی ہوتی ہے وہ انٹرسٹ ہے:

There are no fixed policies, there are only fixed interests.

ماہنامہ الرسالہ کے مطالعہ سے لوگ کس قسم کا اثر قبول کر رہے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں دو خط نقل کئے جاتے ہیں:

۱ میں ایک دینی درسگاہ کا خادم ہوں۔ حالیہ دنوں تک آپ کا سخت ناقد ومخالف رہا حالانکہ میں نے براہ راست آپ کی تصنیفات کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ میری مادری زبان بنگالی ہے۔ اردو تھوڑا بہت سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ عالم نما اکابرین سے بارہا سن کر میں نے بھی آپ کو ایک گمراہ وضدی عالم سوء سمجھ لیا تھا۔ پھر ایک دن خیال آیا کہ کیوں نہ آپ کو پڑھ لیا جائے؟

چنانچہ تلاش کر کے الرسالہ کے چند شمارے، اسفار کی چند کتابیں اور علم جدید کا چیلنج پڑھا۔ پڑھ کر میرا ہوش ٹھکانہ پر آیا۔ آپ کے بارے میں منفی سوچ کے لئے اپنے آپ پر بہت شرمندہ ہوا۔ آپ کے فکر و خیال تو ماشاء اللہ بہت ہی معقول اور حقیقت پسند ہیں بلکہ دور جدید کے ہمہ گیر مسائل کا سب سے آسان و بہترین حل پیش کرتے ہیں..... میں بلا کسی جھجھک کے آپ سے متفق ہوں۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور بھی بہترین تخلیقات کی توفیق دے اور لوگوں کے لئے آپ رہبرِ حق ثابت ہوں۔ بے شک آپ امام الوقت ہیں۔

میرے اکثر احباب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ میرے اندر جدید تعلیم یافتہ مسلمان اور غیر مسلم حضرات میں دعوتی کام کرنے کا جذبہ و شوق ہے، عزم و حوصلہ بھی ہے۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔ اس سے پہلے میں دینی مدارس کی بنیاد ڈال چکا ہوں۔ سب کے سب ترقی پذیر ہیں۔ اب میں آپ کی فکر و نظریات پر مبنی ایک جدید اسلامی درسگاہ بنانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں آپ میری رہنمائی فرمائیں، بہت ممنون ہوں گا۔ کاش بنگلور میں آپ کا کوئی پروگرام ہو تا کہ آپ کو دیکھنے اور سننے کا موقع نصیب ہو جائے۔ گذشتہ ۲۷ یا ۲۸ اگست کی رات B.B.C. کی اردو نشریات کے تحت میزان پروگرام میں آپ کے خیالات سن کر خوشی ہوئی۔ آپ کا تجزیہ برحق ہے۔

ہو سکے تو انگریزی میں ایک سیٹ دعوتی لٹریچر ارسال فرمائیں جو غیر مسلم حضرات میں اسلام کے تعارف کے لئے مفید ہو۔ کچھ ہی عرصہ بعد انشاء اللہ انگریزی دعوتی لٹریچر کافی تعداد میں قیمتاً خریدنے کا ارادہ ہے۔ والسلام

نور الہدیٰ، جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور۔ ۱، یکم ستمبر ۲۰۰۰

۲ کل رات ریڈیو پر بی بی سی لندن کی اردو سروس کی نیوز سننے کے دوران پہلی بار مجھے آپ کی آواز و خیالات سننے کو ملے۔ یہ نیوز کے بعد ہفتہ وار پروگرام میزان میں سننے کو ملا۔ میں قریب دو مہینہ سے صرف شام کے وقت بی بی سی لندن کی نیوز سن رہی ہوں۔ اس سے پہلے کئی بار الرسالہ کے خبر

نامہ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا انٹرویو فلاں دن ریڈیو پر نشر ہوا۔ مگر الرسالہ کی یہ خبر وہ دن گزرنے کے بعد ہی ملتی تھی۔ ہندستان میں مسلمانوں کی حالت پر کئی رہنماؤں کے خیالات سننے کے دوران معلوم ہوا کہ اب بھی کئی عالم ایسے ہیں جو مسلمانوں کے پچھڑے پن و بدحالی کا ذمہ دار یہاں کے سیاسی رہنماؤں اور ان کی تعصب پرستی کو ہی سمجھتے ہیں اور بتاتے ہیں۔ وہ اس چیز کو چیلنج کے طور پر نہیں لے پاتے۔ بیس سال سے لے کر آج تک آپ کے سوا کوئی اور نہیں جو مسلمانوں کی موجودہ حالت کا ذمہ دار خود مسلمانوں کو ہی بتائے۔ یہ بات اتنی آسان بھی نہیں کہ سب اسے جلدی مان ہی جائیں گے۔ مثال کے طور پر میرے شہر کے کئی لوگوں کے علاوہ میرے ایک بزرگ بھی ایسے ہی ہیں۔ وہ الرسالہ تو خوب شوق سے پڑھتے ہیں مگر آپ کی اس بات کو وہ جلدی سمجھ نہیں پاتے۔ اس اختلافی مزاج پر جب بھی میرے اور مذکورہ بزرگ کے بیچ بات ہوتی ہے تو مجھے کافی ٹنشن ہو جاتا ہے۔ آخر میں یہ سوچ کر چپ ہو جاتی ہوں کہ اس حقیقت کو آج نہیں شاید کل سبھی کی طرح یہ بزرگ بھی سمجھ جائیں گے اور مان لیں گے۔

۱۸ اگست کو ستمبر کا الرسالہ ملا۔ یہ دیکھ کر مجھے تھوڑی مایوسی ہوئی کہ اس بار کا الرسالہ صرف دینی مدارس پر ہے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں مدرسہ کی پڑھائی وانتظام اطمینان بخش نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے تشویش کے احساس کے ساتھ الرسالہ پڑھنا شروع کیا اور پڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ پورا الرسالہ پڑھ لیا۔ کئی باب کو میں نے بار بار پڑھا۔ مثلاً دینی مدارس کا امتیاز، مدرسہ کلچر، تجربات کی روشنی میں، وغیرہ۔ الرسالہ پڑھنے کے بعد مجھے جو کچھ ملا اس میں مدرسہ سے متعلق مثبت نظریہ، وسیع جانکاری، علم، اور خواہش کہ کاش میری بھی تعلیم وتربیت کسی دینی مدرسہ میں ہوئی ہوتی یا میرے علاقہ میں لڑکیوں کی کوئی دینی درسگاہ ہوتی جس میں میں اب بھی پڑھنے کے لئے جاسکتی۔ میری دعا ہے کہ اپنے ملک میں مدارس سینٹر جلد از جلد قائم ہو۔ P. 57 پر آپ کے ذاتی تجربات کی سبھی باتوں میں خاص طور پر ۴ نمبر پر درج حدیث کے کلمات ''تم غصہ نہ کرو'' کو میں نے اپنی زندگی کا حصہ بنایا ہے۔ خدا مجھے صبر دے اور غصہ نہ کرنے کی طاقت عطا

فرمائے۔آپ کے پورے الرسالہ میں تمام اچھی باتوں کے درمیان صرف آپ کے ایک عمل کو نہیں سمجھ پائی۔وہ P. 33 پر درج یہ جملہ ہے کہ'' میں نے ۱۹۶۶ کے آخر میں ان سے بیعت بھی کرلی''۔یہ کس طرح کا عمل ہے؟ بیعت کے بارہ میں مجھے کوئی علم نہیں ہے جس کی وجہ سے میں آپ کے اس کام کو سمجھ نہیں سکی ہوں۔

آپ کے ستمبر کے الرسالہ سے میں نے ایک اور چیز پائی ہے اور وہ ہے اپنی محنت سے انگریزی سیکھنا۔جب سے آپ نے مجھے انگریزی سیکھنے کو کہا ہے میں اسی وقت سے اس کام میں لگ گئی تھی مگر الرسالہ پڑھنے کے بعد میں نے اس کام کو اور تیز کر دیا ہے۔انگریزی زبان کے بعد اردو زبان بھی میں شروع سے سیکھوں گی اور انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گی۔خدا میری کوشش کو کامیابی تک پہنچائے اور مدد فرمائے۔خواہش تو میری عربی زبان بھی سیکھنے کی ہے، انشاء اللہ۔آپ کا ستمبر کا الرسالہ دینی مدارس پر ایک بہترین کتاب ہے۔مجھے اس کتاب کی دوسری زبانوں میں اشاعت کا انتظار رہے گا، خاص کر انگریزی اور ہندی زبان میں۔یہ کتاب خاص کر مجھے ان لوگوں کو دینا ہے جو صرف سیکولر تعلیم میں یقین رکھتے ہیں۔ والسلام علیکم

(صوفیہ حیدر، بتیا، چمپارن، بہار)

۳ جدہ کے اخبار اردو نیوز کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر محمد لئیق اللہ خاں نے ۱۹ اگست ۲۰۰۰ کو اپنے اخبار کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل نیز مسلم دنیا کے مسائل سے تھا۔جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے حوالہ سے عام طور پر مسائل اور مخالفانہ سازشوں کا ذکر کیا جاتا ہے مگر یہ منفی طرز فکر نہ اسلام کے مطابق ہے اور نہ عقل کے مطابق۔خود قانون قدرت کے تحت دنیا میں ہمیشہ مسائل رہتے ہیں۔ اور مسلمان ہو یا غیر مسلمان ہر ایک کو مسائل کے درمیان اپنی زندگی کی تعمیر کرنی ہوتی ہے۔اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ مسائل پر فریاد کرنے کے بجائے ان کو ایک فطری حقیقت سمجھ کر اپنی جدوجہد منصوبہ بندی کی جائے۔یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔